(افسانے)
چوپال
احمد ندیم قاسمی

(افسانے)

احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی

خالد!

تم نے اپنے سحر انگیز خطوط کے ذریعے میری سوچوں پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ان خطوط کی روح سے میرے افسانے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔تم ان میں گونجتے سمندروں کے مضطرب پانیوں کے منظر نہ دیکھ سکو گے۔اندھیرے گھنے جنگلوں میں درندوں کی بھیانک دھاڑیں نہ سن سکو گے مگران میں ایک دردمند انسان سوچتا ہوا ضرور محسوس کرلو گے۔

تم شاید اپنے خطوط کے موضوعات بھول گئے ہو گے۔شدت احساس میں انسان کا قلم غیر ارادی طور پر چلتا ہے۔میں تمہارے خطوط کے چند اقتباسات نقل کرتا ہوں۔اس طرح تمہارے دل میں میرے بیشتر افسانوں کا حزینہ عنصر نہیں کھٹکے گا۔اور ساتھ ہی تم دیکھو گے کہ تم نے میرے احساسات کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔

''ندیم' تم خوش کیوں نہیں رہتے؟'' یہاں ہمیشہ کے لیے تھوڑا رہنا ہے۔چار دن ہیں' وہ ہنستے ہنستے کیوں نہیں گزارتے؟ کچھ لکھنا شروع کردو۔افسانے لکھا کرو۔اس طرح تمہارا دل بہلا رہے گا۔

خشک پہاڑوں اور تاریک سرنگوں سے گزرتے ہوئے ہم پشاور پہنچے۔ہمارے میزبان کا مکان پرانے بغداد کی محل سرا کی طرح ہے۔اس کے پاس چند کھنڈر اور کھنڈروں سے پرے کوہ سلیمان کی اونچی اونچی ٹنڈ منڈ چوٹیاں گہرے گہرے بادل اور ان کی اوٹ میں عروس خورشید!

یہاں (بہاولپور میں) ایک مشاعرہ ہوا جس میں کئی گلا پھاڑ پھاڑ کر پڑھنے والے تلامیذ الرحمٰن تشریف لائے تھے۔میں تو اس دن دریا پر تھا۔اف! ندیم' عجیب نظارا تھا۔سورج بادلوں کے سیاہ ٹکڑوں میں چمکتا ہوا۔سبزے سے ڈھکے ہوئے نیچے کنارے۔ ریتلی ڈھلوانیں اور ہمارے سروں پر چیختی ہوئی مرغابیاں۔میں کشتی میں ناچنے لگا!

ندیم' خانہ بدوشی اور سفر کا جادو میری رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔میں زندگی میں کشمکش پیہم کا متمنی ہوں!

ندیم' میں نے محسوس کیا ہے کہ اس ملک میں صرف مصنف ہونا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔غلامی حیات جمیلہ کا خون کردیتی

ہے۔ میں سپاہی مصنف Soldier Writer بننا چاہتا ہوں۔

کوئی ناول شروع کرو۔ لیکن آر۔ ایل اسٹیونسن کی تصنیفات کو سامنے رکھ کر۔ شرر اور تیرتھ رام کی فضول اور طویل منظر کشی سے حتی الوسع پرہیز کرو۔ ادب زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے۔ مگر زندگی تلخ ہے اور اس میں کچھ رنگینی بھی چاہیے! کونین کی گولی پر شکر چڑھا دی جائے تو اسے بچے بھی نگل جاتے ہیں۔

ہم نے اس تھوڑے عرصے میں محبت و خلوص کے کتنے مدارج طے کیے۔ ہم دونوں نہیں بتا سکتے۔ آگے کیا ہوگا؟ ہم زندہ رہیں گے اور دیکھیں گے۔

جس وقت تمہارا خط ملا' میں ایچ۔ بی اسٹوو کے غمناک ناول۔ ''انکل ٹام ز کیبن'' میں گم ہوا بیٹھا تھا۔ یہ ایک بہت دردناک رومان ہے۔ انسان اسے پڑھ کر بے اختیار رونے لگتا ہے۔ پڑھ کر تمہاری طرف بھیج دوں گا۔

کہانیاں لکھتا ہوں اور پھاڑ دیتا ہوں۔ پلاٹ ذہن میں آتے ہیں اور جانے کدھر گم ہو جاتے ہیں۔ میں تو اس بے خانماں ملاح کی طرح ہوں جو ایک ویران چٹانی جزیرے پر اپنے جہاز کے ٹوٹے ہوئے تختے جھاڑیوں میں پھنسے ہوئے دیکھتا رہتا ہے اور روتا رہتا ہے!

اپنا ناول ''بھیڑیا'' ختم کر لیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے مصنف ''ابو القلم حضرت محمد خالد اختر صاحب ڈنگوی ثم گجراتی'' بھی تقریباً تقریباً ختم ہو چکے ہیں!

کاش! میں ایک تیتری کی طرح آزاد ہوتا۔ دور سرسبز وادیوں میں میری ایک جھونپڑی ہوتی جہاں طوفانی راتوں کو میں ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی روشنی میں دل سے نکلے ہوئے جذبات صفحہ قرطاس پر بکھیرتا رہتا

میرے ناول کو دیکھ کر آپ کیا کریں گے؟ ایک سترہ سالہ لڑکے کا چھوٹا سا دماغ آپ ایسے صاحب قلم کے لیے کوئی نئی چیز پیش نہ کر سکے گا۔ بی اے کا امتحان سامنے ہے۔ کئی دفعہ خیال آیا کہ دور بھاگ جاؤں۔ ستلج کے بہاؤ پر کشتی چلاتا جاؤں اور بیکراں سمندر میں داخل ہو جاؤں۔ کیونکہ میں کھلی ہوا' چھٹکے ہوئے تاروں اور نمکین پھواروں کو بہت پسند کرتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ ایک انسان بیس بائیس روپوں میں اچھا خاصا گزارہ کر سکتا ہے اور اس حالت میں جبکہ ہمارے ملک کے ننگے دھڑنگے بے گھر باشندوں کو اپنا بدن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور رہنے کے لیے جھونپڑا میسر نہیں اور جن میں بہتوں کو دو وقت کی روٹی بھی حاصل نہیں ہوتی' بلند ملازمتوں کی خواہش کرنا بھی گناہ ہے۔ جب میں ان فاقہ زدوں' مرجھائے ہوئے کمزور لوگوں کو دیکھتا ہوں تو

مجھے خیال آتا ہے کہ کم از کم مجھے تو صوفوں پر بیٹھنے' مرغن کھانے کھانے اور موٹروں میں سوار ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور بھئی ندیم! یقیناً صوفوں پر بیٹھے اور موٹروں پر سوار ہوئے بغیر بھی انسان زندہ رہ سکتا ہے۔ تم اس طفلانہ فلسفہ سے اکتا تو نہیں گئے؟ میں۔ خالد۔ ایک خانہ بدوش' ایک قلی' ایک معمولی ملاح بننے میں کوئی ہتک نہیں سمجھتا بلکہ اسے اپنا فخر اور اپنا غرور سمجھتا ہوں کہ میں اپنے ہم وطنوں اور دوستوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہو کر کام کروں اور میں یہ کروں گا۔ انشاءاللہ!

میں غریبی اور کھلی ہوا میں خوش رہ سکتا ہوں۔ گول منور چاند کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے تاروں کے نیچے۔ گرجتی' دھاڑتی لپٹتی لہروں کے اوپر میرے جہاز کا تھرکنا اور خاموش پتوار سے پیٹھ لگا کر نیلی کالی رات میں تمباکو کے کش لگانا ۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے خدا ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بہشت ہے!

خالد! میرے افسانے تمہارے ان خطوط سے اثر پذیر ہوئے ہیں اور میں نے کالج کے حسین دنوں میں تم سے وعدہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ میری اولین اور اس لیے عزیز ترین تصنیف تمہارے نام معنون ہے۔

◆◆◆

بے گناہ

سونے والے سو گئے مگر دکھے دلوں کو نیند کیسے آئے۔ رحمان دیر تک جاگتا رہا اور اپنی قسمت کی تہی دستی پر مسکراتا رہا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹیں عجیب مگر دردناک ہوتی ہیں۔ اس نے کروٹیں بدلیں۔ آنکھوں پر پٹی بھی باندھ لی۔ اپنی پھٹی چادر بھی اوڑھ لی۔ پاس ہی ایک جوہڑ میں چیخنے والے مینڈک کی کرخت آواز سے بھی لحہ بھر کے لیے بے خبر ہو گیا مگر اسے نیند نہ آئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی' ماتھا گرم ہوتا گیا اور زندگی رفتہ رفتہ اس کے لیے ایک ناقابل برداشت حبس کی صورت اختیار کرتی گئی۔

جس دن سے اس کی ماں نے دم توڑا تھا وہ کائنات کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگا تھا۔ خاموشی اس کی زندگی تھی۔ اسے نہ احباب کی ضرورت تھی نہ عزیزوں کی۔ اس کی جوان آنکھوں میں ایک خلا سا تھا۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ دن بھر ہل چلاتا تھا اور شام واپسی پر اسے اپنی بوڑھی ماں کی زبان سے شہد سے کہیں میٹھے الفاظ سننے کی امید ہوتی تھی مگر اب .... اب اسے وہ کھلا دالان اور سرخ مٹی سے تھوپا ہوا بھدا مکان کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر بیلوں کے گلے پر چھری پھیر دے' بکریوں کی گردنیں مروڑ ڈالے' کواڑ توڑ دے' سامان جلا ڈالے' کپڑے پھاڑ کر گاؤں سے باہر نکل جائے اور کسی بلندی سے گر کر اپنی زخمی روح کو ان الجھنوں سے ہمیشہ کے لیے رہائی دلا دے مگر مرتے وقت ماں نے اسے کہا تھا۔ ''رحمان بیٹا! میرے بعد جینا۔ تم جینے کے قابل ہو۔ اس عمر میں آنسو تمہاری آنکھوں کو زیب نہیں دیتے۔ مرنے کا خیال تک نہ کرنا۔ موت بوڑھوں کو جچتی ہے' جوانوں کو نہیں۔''

آج اگر اس کا بس چلتا تو موت کا کلیجہ نوچ کر اسے چبا جاتا۔ اس کے تاریک پیراہن کی دھجیاں آگ میں جھونک دیتا۔ اس کے سوکھے ہوئے لمبے اور خوفناک ہاتھوں کو اپنے مضبوط پاؤں سے روند ڈالتا مگر وہ ایک بیکس کسان تھا۔ ایک مفلس دہقان۔ ایک بے یار و مددگار انسان۔

صبح ہوئی۔ گاؤں کا ذیلدار اللہ دتا رحمان کے دروازے پر موجود تھا۔

''رحموں او رحموں!'' اس نے کڑکتے ہوئے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''جی حضور آیا۔'' رحمان نے تیزی سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اس نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ اللہ دتا مونچھوں کو بل دیتا ہوا اندر داخل ہوا اور بولا ''کئی بار تم سے کہہ چکا ہوں کہ زمین کا لگان مطالبے پر ادا کر دینا چاہیے۔ مگر تم ہو کہ مکان کے اندر چھپ کر مجھ سے بچنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں تم جیسے بھکاریوں کے کان کھینچ لیا کرتا ہوں۔ پانچ روپے ابھی ابھی پیدا کرو ورنہ میں گاؤں کے سارے چوکیداروں کو بلوا کر تمہارا بھرکس نکلوا دوں گا۔''

''جی میں کوشش کر رہا ہوں۔ آپ جانتے ہیں' میں مقررہ دنوں کے اندر ہی معاملہ صاف کر دیتا ہوں۔ اس قدر سخت الفاظ تو اسے سنانے چاہئیں جو آخری وقت تک ٹالتا ہی چلا جائے۔''

''بکواس کرتا ہے؟ مجھے آنکھیں دکھاتا ہے؟ قسم خدا کی ہاتھ میں لاٹھی ہوتی تو سر توڑ دیتا۔ کتوں کی طرح گھور گھور کر دیکھ کیا رہا ہے؟''

رحمان کے آنسو خشک ہو گئے' کلیجہ کانپنے لگا' بازوؤں کی رگیں ابھر آئیں' ماں کا غم بھول گیا اور تن کر بولا۔ ''ملک صاحب! میں اس قسم کے الفاظ سننے کا عادی نہیں ہوں۔ بہتر ہے یہاں سے تشریف لے جایئے' ورنہ''

''ورنہ؟....... ورنہ کیا؟'' ذیلدار کا ہاتھ مونچھ کی نوک سے علیحدہ ہو گیا اور ابرو آنکھوں پر جھک آئے۔

''ورنہ میرے بازوؤں میں بھی جان ہے۔''

''اچھا'' ذیلدار نے آگے بڑھ کر اپنی پوری طاقت سے رحمان کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا تو وہ شیر کی طرح ذیلدار پر جھپٹا اور آن کی آن میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ گھونسوں سے اس کی ہڈیاں ڈھیلی کر دیں اور جب جی بھر گیا تو اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ اسے کسی قسم کے پشیمانی کے احساس نے نہ ستایا۔ اس نے اپنی دانست میں ذیلدار کو ایک سبق سکھایا تھا اور وہ مطمئن تھا کہ اس کی غیرت نے ذیلدار کے سامنے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

گاؤں میں یہ واقعہ کیسے مشہور ہوتا۔ بے عزتی کے خوف سے ذیلدار کے منہ سے اف تک نہ نکلی۔ اگر کوئی چہرے کی رنگت کے تغیر کا باعث دریافت کرتا تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ ایک زہریلے کیڑے نے تمام چہرے کا ستیاناس کر دیا ہے۔

اسی دن شام کو رحمان آٹا گوندھ رہا تھا۔ چڑیوں کے لاتعداد غول ''شی'' کی آواز سے اس کے مکان پر سے گزر جاتے تھے۔ چمگادڑیں بیری کی سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے ٹکرا کر پھڑ پھڑاتی تھیں اور پھر ہوا میں تیرنے لگتی تھیں' بیل جگالی کر رہے تھے' ایک بکری اپنے ننھے سے بچے کے ماتھے پر منہ رکھے کھڑی تھی۔

یکایک گاؤں میں ایک شور اٹھا اور آن کی آن میں رحمان کے قریب ہوتا گیا وہ دوڑ کر مکان پر چڑھ گیا۔ دور جنوب مشرق

کنارے پر ایک زبردست چمک تھی۔ آگ اور دھواں...... اس کے دل پر ہتھوڑا سا پڑا۔ ماتھے سے پسینہ پونچھا اور مکان سے اتر کر دوڑتا ہوا گاؤں کے چوپال پر جا پہنچا۔

"وہ کیسی آگ ہے احمد خان؟" اس نے اپنے ایک دوست سے دریافت کیا جو اس کی طرف دوڑا آ رہا تھا۔

"تمہیں ابھی تک معلوم نہیں؟"

"نہیں۔"

"تمہارا کھلیان جل گیا۔"

رحمان سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ آنکھوں میں آنسو ابل آئے۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔

"بہت افسوس ہے رحمان بھائی' مجھے تمہارے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔"

"ہونی چاہیے میرے دوست۔ میں اب ایک مفلس اور قلاش انسان ہوں' بے یار و مددگار۔"

"کیوں؟ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں اس قسم کی شکایت کرنا مناسب نہیں۔"

اسی کے بعد احمد خان نے رحمان کا ہاتھ پکڑا اور گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کی طرف لے چلا۔ ابھی تک کھلیان پر جلے ہوئے غلے کی چمک باقی تھی۔ رحمان کا خون آنے والے سال کے خیال سے خشک ہوا جا رہا تھا۔ ان کے پاؤں کی چاپ سے جھینگروں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ سوکھے ہوئے پتے ٹوٹتے تھے اور فضا میں ایک خوفناک مدھم سی گونج کانپ جاتی تھی۔ گاؤں میں ابھی تک شور مچا ہوا تھا۔ رحمان کی آنکھوں سے اب آنسوؤں کی جگہ شعلے نکل رہے تھے۔ وہ چلتے چلتے اپنے ہونٹ اپنے دانتوں سے کاٹ لیتا تھا۔ ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے احمد خان نے کہا۔ "بھائی' جو ہونا تھا ہو چکا' اب سوچنا یہ ہے کہ یہ ہے کس شیطان کا کام' تم کسی کے دشمن نہیں' گاؤں کا بچہ بچہ تمہارا دوست ہے۔ پھر یہ کرتوت کس نے کی؟"

"احمد خان' سچ کہوں' یہ ذیلدار میرے آنکھوں میں کھٹک رہا ہے۔ اس نے......."

یکا یک رحمان رک گیا۔ احمد خاں کی حرکات پر اسے حیرت ہونے لگی۔ رحمان کی باتوں سے بے خبر ہو کر وہ دائیں بائیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور پھر بار بار اپنا داہنا ہاتھ اپنی جیب تک لے جاتا تھا۔ رحمان نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "تمہاری جیب میں کیا ہے احمد خاں؟"

احمد خاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہاتھوں میں رعشہ آ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا کر گر گیا۔ رحمان نے جھپٹ کر اس کی

جیب پر ہاتھ مارا...... ایک ننھا سا پستول...... احمد خاں کی کشمکش کے باوجود اس نے پستول اس کی جیب سے باہر نکال لیا اور کڑک کر پوچھا۔ "یہ کیا معاملہ ہے احمد خاں؟"

"معاف کرنا رحمان خاں' ذیلدار نے مجبور کیا تھا کہ تمہیں قتل کر دوں مگر میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے بخش دو۔ مجھے معاف کر دو بھائی' میں نے غلطی کی۔ میں بھٹک گیا تھا میرے دوست۔"

"خدا تمہیں غارت کرے بدبخت انسان' مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ تم میرے کتنے عزیز دوست تھے!"

"میری قسمت!" احمد خان نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس کے ان دو الفاظ میں بھی تصنع سا تھا۔

رحمان پستول لیے ہوئے سیدھا گھر آیا۔ دروازہ بند کر دیا' پستول سرہانے رکھا اور کھانا کھائے بغیر ماں کی یاد' کھلیان کی تباہی' ذیلدار کے ظلم اور احمد خان کی غداری پر غور کرتا ہوا سو گیا۔

آدھی رات تھی کہ اس کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ چونک کر اٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا "کون ہے؟"

"پولیس۔ دروازہ کھولو۔"

"پولیس!" اس نے دبی زبان میں کہا اور پستول کو دوڑ کر بھوسے میں چھپا دیا۔ دروازہ کھولا۔ گاؤں کا چوکیدار شمع لیے کھڑا تھا۔ پانچ چھ سپاہی اس کے پیچھے تھے اور ان کے قریب ذیلدار کھڑا مسکرا رہا تھا۔

سپاہی مکان کے اندر گھس گئے۔ ذیلدار' چوکیدار اور ایک سپاہی نے رحمان کو حراست میں لے لیا۔ رحمان خاموش رہا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ سپاہی مٹی کے برتنوں کو اٹھا کر ان میں جھانکتے اور پھر زمین پر دے مارتے۔ اس کے بوسیدہ کپڑوں سے اپنے بھدے بوٹ پونچھتے چارپائیوں کو الٹتے جاتے۔ ایک نے تو رحمان کے گڑ کا برتن توڑ کر سب کچھ اپنی جیبوں میں ڈال لیا۔ اس چار دیواری میں ایک قیامت سی مچی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پولیس کے یہ سپاہی بھوکی گدھیں ہیں جو ایک گلی سڑی لاش پر جھپٹ جھپٹ کر اس کی ہڈیوں کا گودا تک نوچ رہی ہیں۔ رحمان خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ انصاف کے ٹھیکیدار اس کی محدود پونجی کو تباہ کیے جا رہے ہیں مگر اس کی زبان سے اف تک نہ نکلی۔ وہ سب کچھ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ذیلدار مسکراتا رہا اور چوکیدار کانپتا رہا۔ جب سب مکان کی تلاشی لے لی گئی اور کسی قسم کی خطرناک اور ناجائز چیز برآمد نہ ہوئی تو تمام سپاہی رحمان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر رحمان کی پیٹھ پر ایک بید مارا۔ رحمان کانپ اٹھا۔ اس کی کنپٹیوں میں خون ابلنے لگا۔ ہونٹ جلنے لگے۔

''کہاں ہے تمہارا پستول؟'' بید والے نے ڈپٹ کر کہا جو وضع قطع سے حوالدار معلوم ہوتا تھا۔

''میرا کوئی پستول نہیں' میں غریب کسان ہوں' کسی کا دشمن نہیں' میرا کام ہل چلانا ہے' پستول چلانا نہیں''

''لیکن تمہارے پاس ایک پستول ہے ضرور۔''

''نہیں جناب' کوئی نہیں۔''

''بکواس کرتا ہے کم بخت' بتا دے ورنہ پچھتائے گا۔''

ابھی رحمان جواب بھی دینے نہ پایا تھا کہ ذیلدار نے آگے بڑھ کر کہا۔''مگر اس بھوسے کے ڈھیر کو بھی دیکھا؟''

تمام سپاہی دوڑ کر بھوسے کے ڈھیر پر چڑھ گئے۔ پستول مل گیا۔ دو سپاہیوں نے رحمان کو ہتھکڑی لگائی اور اسے گاؤں کے چوپال پر لے گئے۔

صبح صبح چوپال پر سب گاؤں والے اکٹھے ہو گئے۔ عورتیں چھتوں پر کھڑی رو رہی تھیں۔ سینکڑوں آنچل بار بار آنکھوں تک اٹھ جاتے تھے۔ چوپال پر گاؤں والوں کی چہ میگوئیوں سے ایک عجیب سی دبی دبی سرسراہٹ کی آواز آتی تھی۔ رحمان کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے اپنی پھٹی ہوئی جوتی کو دیکھ رہا تھا۔ ذیلدار اپنا سب سے اچھا لباس پہنے مسکرا رہا تھا۔ سپاہی حقے کے کش لگا رہے تھے۔ اتنے میں حوالدار اٹھا اور بولا۔''اچھا' رحموں' اٹھو' کال کوٹھڑی کی ہوا کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کم بخت' پستول تو تم نے بہت اچھا حاصل کر لیا تھا کہیں سے' کس سے لیا تھا؟'' یہ کہہ کر حوالدار نے ہاتھی دانت کے دستے والا پستول ہوا میں اچھالا۔ رحمان نے سب لوگوں پر نظر ڈالی۔ احمد خاں ایک کونے میں دبکا بیٹھا تھا۔ رحمان کی سرخ نم آلود آنکھیں دیکھ کر کانپ اٹھا۔ رحمان کے دل میں پرانی دوستی کی یاد کھٹک گئی اور پھر احمد خاں ایسا بزدل کم ظرف انسان! وہ کمزور کو برباد کر کے خود کیا خوش رہے گا۔ سر جھکا لیا۔

''رحموں'' حوالدار نے پھر پوچھا۔''بتا دو' شاید تم اس طرح رہا کر دیے جاؤ۔''

''تھانیدار صاحب'' چھت پر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ تمام نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں۔ ذیلدار کی اکلوتی بیٹی سب عورتوں سے آگے بڑھ کر کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ رنگ کے دوپٹے میں اس کے دہکتے ہوئے رخسار یوں چمک رہے تھے جیسے ساون کی بدلیوں میں چاند۔ رحمان نے بھی اس طرف دیکھا۔ ماں کی موت کا مارا' مفلس' تنگدست' رحموں ہتھکڑیوں کی فولادی گرفت سے بے پروا ہو کر مسکرایا۔ لڑکی بھی مسکرائی' گاؤں کے چوپال میں پانچ چھ سو آنکھوں کے گھورتے ہوئے دائرے میں پولیس کے سامنے!

رحمان نے محسوس کیا کہ اس نے ہتھکڑیوں کی جگہ ہلکے ہلکے پھولوں کا ہار پہن رکھا ہے۔ ماں کی موت تقدیر کی بات ہے۔ کھلیان کا

جلنا کوئی نرالا حادثہ نہیں۔ ذیلدار کے حملے ۔۔۔۔۔۔۔۔وہ تھا ہی اس قسم کا کمینہ انسان۔ احمد خان کی غداری! چودھویں صدی کی دوستیاں' حباب آب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اور اب اس لڑکی کی گہری گہری سیاہ آنکھیں' پھول جیسے رخسار' شیشے جیسا ماتھا' بیضوی چہرہ اور گول سفید ٹھوڑی۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر اس کی مردانہ جرات پولیس والوں کے سامنے اکڑ کر کھڑی تھی۔

''کیوں کیا بات ہے لڑکی؟ حوالدار نے لڑکی کو گھور کر دیکھا اور گھبرا کر ماتھے کا پسینہ پونچھ لیا۔

''میں پستول دیکھ سکتی ہوں؟''

''کیوں؟''

''شاید میں بتا سکوں ملزم نے یہ کہاں سے حاصل کیا ہے؟''

ذیلدار تھرا اٹھا۔ اس کے ہاتھ سے اس کی بیمیں چھڑی گر پڑی اور زبان لوہے کی طرح اکڑ گئی۔ حوالدار نے بڑھ کر پستول لڑکی کو دے دیا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ایک بار آنکھوں کو ملا اور پھر سر جھکائے ہوئے بولی۔ ''یہ تو میرے ابا جی کا پستول ہے۔''

ہر طرف ایک ہولناک سکوت چھا گیا۔ ذیلدار کا سر چکرا گیا۔ حوالدار نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیوں ملک جی' آپ کی صاحبزادی سچ کہتی ہے؟''

''جھوٹ بکتی ہے ناخلف' بے حیا' گستاخ۔'' اور اس کے ہونٹ یہ الفاظ کہتے ہوئے بھی سنے گئے۔ ''حرامزادی۔''

وہ اٹھا اور حوالدار کو ایک طرف لے گیا۔ اس کی مٹھی گرم کی اور پھر دونوں اپنی اپنی جگہ پر آ گئے۔ لوگ لڑکی کی جرات پر حیران کھڑے تھے۔ بے گناہ رحموں ان کی نظروں میں ایک ''ہیرو'' کی حیثیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ ذیلدار کا وجود سب کی آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ حوالدار کی آمد پر سب خاموش ہو گئے۔ عورتوں کی سرگوشیاں بند ہو گئیں۔ ذیلدار کو خوب ضرورت گھوڑا ابھی دانہ کھاتے کھاتے منہ اٹھا کر مجمع کی طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا رحموں' تمہارا کیا بیان ہے؟'' حوالدار نے پوچھا

''حضور'' رحمان نے چھت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اور سینے کو دباتے ہوئے کہا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں لوگ اس کے دل کی دھک دھک نہ سن لیں۔ ''حضور سچی بات بتاؤں۔ میں ایک بے یارومددگار انسان ہوں۔ میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ باپ مدت ہوئی مر چکا ہے۔ ماں جنت ہوا اس سے جا ملی ہے۔ اکیلا آدمی ہوں۔ اس تمام گاؤں میں میرا کوئی دشمن نہیں۔ تمام گاؤں موجود ہے۔ ذیلدار صاحب کے سوا کوئی کہہ دے کہ میں نے کبھی کسی کا کچھ بگاڑا ہے۔''

''ذیلدار صاحب تیرے خلاف کیوں ہیں؟''

''خداواسطے کا بیر ہے جناب۔ مجھ غریب کا کھلیان بھی کل شام انہی نے جلایا اور مجھے کنگال بنایا۔ مجھے قتل کرنے کی تجویز بھی کی۔ ان کے کرایہ کے ٹٹو سے میں نے پستول چھین لیا۔ اندھیرے میں میں اسے نہ پہچان سکا۔ وہ تو بچ نکلا لیکن یہ پستول اب میری گرفتاری کا سبب بن رہا ہے۔''

''جب یہ بات تھی تو تم نے پستول چھپانے کی کوشش کیوں کی؟''

''میں ڈر گیا تھا حضور۔ میں نے کبھی پولیس کو اپنے گھر پر نہیں دیکھا۔ مجھے سرخ پگڑی سے خوف آتا ہے حوالدار جی۔''

''بہانے تراشتا ہے بدمعاش''

''لیکن حضور اس لڑکی کی بات تو سچی ہے نا! وہ میری تو کچھ نہیں لگتی' ذیلدار جی کی اکلوتی لڑکی ہے۔''

''ہاں' وہ سچ کہتی ہے' انہی کا پستول ہے لیکن تو نے چوری کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔''

رحمان کو محسوس ہوا کہ آسمان تحلیل ہو کر اس کے سر پر چٹانوں کی شکل میں گر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چوپال سے اترتے وقت اسے زمین کی جگہ کھولتے ہوئے خون کا ایک مضطرب سمندر نظر آیا جس میں تمام کائنات آہستہ آہستہ ڈوبی جا رہی تھی۔ ہاں چھت پر ایک چمک سی محسوس ہوئی اور سہم گیا۔ ننھے بچوں کے بلکنے کی آوازیں سنیں۔ بوڑھوں کی ہچکیاں بھی ایک صدائے بازگشت کی طرح اس کے کانوں تک آئیں اور پھر اس نے حوالات کا بھاری دروازہ بند ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ گیلے بدبودار فرش پر بیٹھ گیا اور سر کو زانوں پر رکھ کر سوچوں میں ڈوب گیا۔

دو سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی اور اسے لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ پہلے پہل تو اسے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں دور سے منہ پھاڑ کر جھپٹنے والی بلائیں معلوم ہوتی تھیں مگر کہتے ہیں کہ انسان دوزخ سے بھی آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گا' سو وہ جیل کی ہر چیز سے انس کرنے لگا۔ چکیوں کی مسلسل گھرر گھرر میں اسے اک نوخیز لڑکی کی کانپتی ہوئی رسیلی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہر کوٹھڑی کی چھت سے اسے بڑی محبت تھی۔ ایک کھردرے کمبل سے اپنا مضبوط جسم لپیٹ کر وہ تمام رات رخصت کی صبح کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اکثر اس کی ماں اسے بہلاتی ہوئی نظر آتی تھی مگر اس کا آوارہ تصور اپنی ماں' اپنے گاؤں اور اپنے گھر سے اڑ کر پھر اسی دوشیزہ کی آنکھوں پر منڈلانے لگتا تھا۔ وہ اس امید پر جی رہا تھا کہ رہا ہوتے ہر گاؤں میں جا کر پہلے اپنی ''جواہر'' کو دیکھے اور پھر اپنے سنسان گھر کی خبر لے۔

ڈیڑھ سال نہایت آرام سے گزر گیا۔ جیل کے کسی اہلکار نے اسے کبھی برا بھلا نہ کہا۔ وہ وقت پر اپنا کام کر کے موج کی تیزی پر دراز ہو جاتا اور صبح پھر اپنے فرض میں ہمہ تن مشغول! اچانک ایک دن اس کے بند بند میں درد ہونے لگا۔ اس کا جسم ٹوٹنے لگا اور اس نے آدھا کام ختم کر کے اپنے آپ کو فرش پر گرا دیا۔ شام کو ایک سپاہی آیا تو دیکھا کہ رحمان فرش پر پڑا زور زور سے کراہ رہا ہے۔ نبض خطرناک حد تک تیز تھی' ماتھا جل رہا تھا' ہونٹ دہک رہے تھے' آنکھیں انگارہ بن گئی تھیں۔ اسے جھٹ ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ مگر مرض میں کمی واقع نہ ہوئی۔ ایک ہفتہ کے اندر اس کی وجاہت میں کمی آ گئی اور اس کا سڈول جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا' سر سے بال گر گئے' آنکھیں اندر دھنس گئیں' ہونٹ خشک ہو کر پھٹ گئے' زبان سفید ہو گئی' اٹھنے بیٹھنے تک کی سکت نہ رہی۔ ڈاکٹر نے اس کی رہائی کی سفارش کی۔ حکومت نے رحم کی درخواست قبول کر لی اور گاؤں میں ذیلدار کو خبر بھیج دی کہ "رحمان رہا ہو کر آ رہا ہے مگر سخت بیمار ہے۔ اسٹیشن سے اس کی چارپائی اٹھوانے کا انتظام کرو۔"

ظالم کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔ وہ غریب نوجوان اس کے مردود غصے کا شکار ہو کر اب موت کا شکار ہونے والا تھا۔ جھٹ کچھ آدمی بلائے اور رحمان کو اسٹیشن سے اٹھوا کر گاؤں لے آیا۔ رحمان کا مکان گر چکا تھا۔ گاؤں کے چوپال پر اس کی چارپائی رکھوا دی گئی۔ گاؤں کے بچے' جوان' بوڑھے' عورتیں جوق در جوق ایک نہ ختم ہونے والے سیلاب کی طرح چوپال پر امڈ آئے۔ رحمان ایک مضمحل اور مردہ سی مسکراہٹ سے سب کی مزاج پرسی کا جواب دیتا گیا اور اپنے سوکھے ہوئے زرد ہاتھ سے مصافحہ کرتا گیا۔

جب تمام عورتیں اور مرد چلے گئے تو سامنے سے جواہر آتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا بے تحاشا دھڑکتا ہوا نحیف دل ایک لمحے کے لیے تھم گیا۔ جواہر کی حسین اور جوان آنکھوں سے غم واندوہ جھانک رہے تھے۔ رخسار سوکھ کر باسی' پر شکن اور وقت سے پہلے توڑے ہوئے سیب کی طرح بے رونق تھے۔ وہ رحمان کے نزدیک آ کر جھکی' بے اختیار اس کی ترستی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور رحمان کی پیاسی آنکھوں میں جا گرے۔ رحمان نے آنکھیں بند کر لیں اور انہیں آنکھوں کے رستے وہ دو قیمتی آنسو پی گیا۔ وہ اپنے آپ کو قوی اور تندرست انسان خیال کرنے لگا مگر یہ وقتی جوش تھا۔ آنکھیں کھولیں' جواہر کے مایوس چہرے پر نگاہ دوڑائی۔ ادھر ادھر اکا دکا لوگ بیٹھے تھے وہ کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے اتنا بھی نہ بتا سکا کہ وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ' اپنے جسم کا ہر ٹکڑا' اپنے قلیل خون کا ہر قطرہ جواہر کے ان دو معصوم آنسوؤں پر نثار کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے اور حقیقت میں نثار کر چکا ہے۔

جواہر نے صرف یہ پوچھا۔ "رحمان خان' بیمار ہو گئے ہو؟ اچھے ہو جاؤ گے۔ مولا کریم کرم کرے گا۔ میں تمہاری دعا گو ہوں۔ تم جیتے رہو۔ جیتے رہو۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے آنچل سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔

رحمان ششدر سا رہ گیا۔ اس دن شام تک اس کے ہونٹ نہ ہلے' آنکھیں نہ کھلیں' دل بدستور کمزور رفتار سے دھڑکتا رہا اور نبضیں اس طرح ہلکی ہلکی جنبش سے کانپتی رہیں۔

شام کو ذیلدار اس کے پاس آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "رحمان خان مجھے معاف کر دو میں شرمندہ ہوں۔"

رحمان خاں نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو معاف کرتا ہوں جناب' مگر خدا کی معافی کا میں ذمہ دار نہیں۔"

اسی دن آدھی رات کو رحمان نے دم توڑا۔ ادھر اس کی روح نے عرش کی جانب پر پھڑ پھڑائے' ادھر جواہر کے گھر ٹمٹماتا ہوا دیا بھک سے بجھ گیا۔ رات کی رات یہ خبر گاؤں میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔ لوگوں کی چیخوں میں ایک عورت کی دردناک آواز اس طرح بلند ہو رہی تھی' جیسے کونجوں کے قافلے میں اس کونج کی چیخ جس کا محبوب کسی شکاری کے ہاتھوں زخمی ہو کر گر چکا ہو۔

رحمان کو دفنا دیا گیا۔ اس کے مرنے کے ایک ہفتہ بعد اچانک ذیلدار کے بیلوں پر کسی عجیب بیماری کا حملہ ہوا اور تین بیل تو دو دن میں پھڑک کر مر گئے۔ تیسرے دن اس کا خوب صورت گھوڑا ایک بلند چٹان سے پھسلا' سنبھل نہ سکا اور لنگڑا ہو گیا۔ ذیلدار کا ننھا بچہ شام کو جھولے میں سوتے سوتے چیخ اٹھا اور اچھل کر زمین پر آ رہا۔ نیچے لوہے کا چولہا پڑا ہوا تھا' اس کا دماغ پھٹ گیا اور آدھ گھنٹہ میں اس کا دم نکل گیا۔ چوتھے دن ذیلدار خود چارپائی پر دراز ہو گیا۔

جواہر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور اسے معلوم تھا کہ یہ خدائی قہر ہے۔ بے گناہ کا خون خاموش نہیں رہتا۔ وہ دوڑتی ہوئی رحمان کی قبر پر گئی۔ وہ روزانہ اس کی قبر سے آ کر لپٹ جاتی تھی اور آنسوؤں سے قبر کا تعویز دھو جایا کرتی تھی مگر آج اس نے آتے ہی چیخنا شروع کر دیا۔ "میرے رحمان۔ تم دنیا کے لیے مر چکے ہو مگر میرے لیے زندہ ہو۔ تم جانتے ہو باپ کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو مگر بیٹی اس کی تباہی نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارے غصے کا فرشتوں نے بدلہ لینا شروع کر دیا ہے۔ عنقریب میرا بھولا باپ مر جائے گا' پھر میں کہاں جاؤں گی رحمان؟ مجھ پر لوگ ظلم کریں گے۔ میرا کوئی نہ رہے گا۔ میرے باپ پر رحم کرو۔ اللہ میاں کے آگے اس کی سفارش کرو۔ اس کی جگہ مجھے اپنے پاس بلا لو رحمان! ہماری محبت کتنی نادار تھی' کتنی پیاسی' بھوکی' محروم! میں ابھی تک تمہاری محبت میں جل رہی ہوں رحمان جلتی رہوں گی۔ مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میرے باپ پر رحم کرو محبوب میرے! تم نے تو اسے بخش دیا تھا رحمان پیارے!"

اور دوسرے دن ذیلدار کا بخار اتر گیا مگر جواہر کو جیسے آگ لگ گئی۔ شام ہوتے ہوتے اس کی زبان پھٹ گئی' گلا سوج گیا۔ لوگوں نے کہا کہ قبرستان کے بھوت چمٹ گئے ہیں۔ حکیم اور پیر بلائے گئے لیکن نسخہ گنڈا تجویز ہونے سے پہلے جواہر نے خدا کے آگے جان دے دی!

گاؤں والیوں نے پیٹ پیٹ کر اپنے سینے لال کر لیے۔ بال نوچ لے۔ دیواروں سے سر پھوڑ لیے۔ جواہر ایک ہر دلعزیز خاتون تھی۔ ذیلدار ایک دیوار سے پیٹھ لگائے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آسمان کی طرف تکتا رہا۔ جواہر کو رحمان کے پاس ہی دفنا دیا گیا۔

اب بھی جب پو پھٹے دہقان کندھوں پر ہل دھرے یہاں سے گزرتے ہیں تو آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ان دو سادہ مٹی کی ڈھیریوں کو دیکھ کر اپنے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور فاتحہ پڑھ کے آگے چل دیتے ہیں۔

دونوں کی قبروں سے دو جھاڑیاں اگ کر ایک دوسرے سے مل گئی ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کی ٹہنیاں ایک دوسرے میں یوں پیوست ہو گئی ہیں جیسے یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی جھاڑی ہے

دوپہر کو بوڑھا احمد خاں اکثر ان قبروں کے قریب کھانستا سنا گیا ہے اور کئی چرواہوں نے دیکھا کہ وہ قبروں پر سر رکھ کر گھنٹوں روتا رہتا ہے۔

خنک اور خاموش شاموں کو ضعیف سفید ریش ذیلدار ان قبروں کے پاس آ کر اپنے مضمحل ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ رحمان ابھی قبر پھاڑ کر اسے دبوچ لے گا۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔ دور کسی دھنسی ہوئی قبر میں کسی الو کی کرخت آواز کے سوا قبرستان مردہ سکوت میں غرق ہوتا ہے۔ ہوا سرسراتی ہوئی اس جھاڑی سے گزرتی ہے اور اس کے سفید بالوں کو چھیڑتی آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی تاریکیوں میں غائب ہو جاتی ہے!

◆◆◆

دیہاتی ڈاکٹر

ایک عزیز کی علالت کی وجہ سے مجھے اپنے علاقے کے مرکزی قصبے میں جانا تھا۔ سرکاری خیراتی ہسپتال وہیں تھا۔ میں اپنی درمیانہ قد کی سبز گھوڑی دوڑائے جا رہا تھا۔ مکی کے گہرے سبز کھیتوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی دور سبز تاریکیوں میں گم ہو رہی تھی۔ جھکے ہوئے بلند پودے رکابوں کے ساتھ زور سے ٹکرا رہے تھے اس لیے چھر رچھر رکی ایک مسلسل آواز سے تمام فضا گونج رہی تھی۔ کنوئیں رواں کی راگنیوں سے اپنے آقاؤں کا جی بہلا رہے تھے۔ ننھی اور نوخیز لڑکیاں پودوں کے پاس بیٹھی کھرپا چلا رہی تھیں۔ کچھ ادھیڑ عمر کی عورتیں کھیتوں میں گھاس اکٹھی کر رہی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی بچہ دھوپ میں کھیت کے کنارے انگوٹھا چوس چوس کر آسمان کی بلندیوں کو گھور رہا تھا۔ درختوں کی شاخیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ملائم جھونکوں سے ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہی تھیں۔ ایک کنوئیں پر حقے کی محفل گرم دیکھ کر میں نے لگام کھینچی اور اتر کر حقے کی جانب بڑھا۔

ایک بوڑھا اور دو نوجوان پتھروں پر ایڑیاں دھرے باری باری سرحدی حقے کے کش لگا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی تینوں اٹھے۔ نہایت ادب سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔ بوڑھے نے رسمی طور پر نہایت آہستگی سے کہا ''آیئے' خیر سے آنا ہوا؟'' پھر ایک جوان کو اشارہ کیا جس کے لمبے لمبے سیاہ پٹے اس کے لال لال رخساروں پر بکھر رہے تھے۔ وہ کھاٹ جھاڑ کر اٹھا لایا۔ حقہ تازہ کیا گیا۔ تمباکو کو مسل کر ڈالا گیا۔ میں دو چار کش لگا کر اٹھا تو میری جیب میں ایک بوتل کا سر دیکھ کر بوڑھا بولا۔

''ہسپتال جائیں گے آپ؟''

''ہاں چچا۔''

''خیریت تو ہے گھر میں؟''

''کچھ تکلیف ہے۔''

''اللہ فضل کرے'''ڈاؤر'' کو جانتے ہیں آپ؟ یہ نیا ڈاؤر؟''

''کوئی نیا آیا ہے کیا؟ میں تو نہیں جانتا۔''

''سنا ہے بڑا ظالم ہے وہ اور سنا کیا دیکھا بھی ہے۔ بغیر پیسے کے وہ دوائی دیتا ہی نہیں۔''

"اچھا؟ ڈاکٹر تو شریف ہونا چاہیے۔"

"ہونا تو چاہیے ملک صاحب! مگر وہ تو سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا۔ پرسوں بڑھیا کی کھانسی زور پکڑ گئی تھی۔ میں بھاگا بھاگا وہاں پہنچا۔ مجھے کیا معلوم کہ پہلا ڈاکٹر بدل گیا ہے۔ میں نے سلام کیا تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ میں نے کاندھا ہلایا تو مجھ پر برس پڑا اور خدا جانے فرنگیوں کی زبان میں کیا واہی تباہی بک گیا۔ شکل دیکھو تو بیمار کوے کی طرح۔ میں بیٹھا رہا اور جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے بڑھیا کے حالات کھل کر بیان کرنا چاہے مگر ایک کھانسی کا نام ہی لیا تھا کہ کھٹ سے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں تو چکرا گیا ملک جی! وہ کوئی اتنا اللہ کا پیارا تو تھا نہیں کہ اس کو پہلے ہی سے مریضہ کا حال معلوم ہوتا۔ پھر میں کرم پوڈر (کمپاونڈر) کے پاس گیا تو اس نے الگ نخرے شروع کر دیئے۔ کوئی بھلا آدمی باہر بیٹھا تھا' مجھے الگ لے جا کر سمجھایا کہ اسے کچھ پیسے دو تب دوائی ملے گی۔ آج کل ہسپتال پر حریصوں کا راج ہے۔" میں نے چار دن ہوئے شہر میں دونی کی سبزی بیچی تھی' وہی پیش کر کے روٹھے کو منایا۔ کیا بتاؤں ملک جی! خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ کوئی چار قطرے بوتل میں ٹپکا دیئے اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر برآمدے میں دھکیل دیا۔ یہ خیراتی ہسپتال ہے ملک صاحب! اور اگر خیراتی نہ ہوتے' پھر ہم غریب لوگ تو خاک چاٹتے مر جاتے۔ اور ان چار قطروں سے بڑھیا کو اتنا افاقہ تو ہوا ہے کہ کل چار سبز مرچیں کچی نگل گئی اور پانی تک نہ پیا۔"

میں ہمہ تن گوش بوڑھے کی نہ ختم ہونے والی تقریر سنتا رہا اور وہ ہر لمحہ نئے جوش سے باتیں کرتا گیا۔ آخر اس سے مصافحہ کر کے گھوڑی پر سوار ہوا۔ میں سوچنے لگا' کیا یہ ڈاکٹر لوگ بھی اتنے حریص ہوتے ہیں۔ حریص اور بددماغ! مریض کو دیکھا اور چل گئے۔ نئے اور موٹے شکار کی تاک میں بیٹھے رہے۔ کوئی نصیبوں کا مارا آ پھنسا تو اس کی کھال اتار لی۔ یہ اچھی شرافت ہے!۔

گھوڑی اڑی جا رہی تھی۔ آگے ایک موڑ تھا۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکی۔ جوں ہی مڑی تو پانچ گز کے فاصلے پر ایک بڑھیا رینگتی نظر آئی۔ میں نے اپنی پوری طاقت سے باگیں کھینچیں۔ گھوڑی پچھلے پاؤں پر کھڑی ہوگئی اور بڑھیا چیختی ہوئی مکی کے مضبوط پودوں کو توڑتی کھیت کے اندر جا گری۔

"ہے بچہ' میں تو پہلے ہی مر رہی تھی۔"

معاف کرو مائی' گھوڑی بے قابو ہو گئی تھی۔ کہاں جاؤ گی؟"

"ہسپتال۔"

"کیوں؟"

اس نے ایک آہ بھری اور کھیت کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مر رہی ہوں بیٹا۔'' اس کے سفیدی مائل خاکستری بال مرجھائے ہوئے کانوں کے آس پاس جٹوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے اردگرد لاتعداد جھریاں تھیں اور ماتھے اور رخساروں پر بے شمار گہری لکیروں نے تمام چہرے کو خوفناک حد تک بوڑھا بنا دیا تھا۔

اس نے اپنے کپڑے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''پانی پی پی کر پیٹ اپھر جاتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی۔ تھوڑا تھوڑا بخار بھی رہتا ہے۔ دو چار سانسیں جو باقی ہیں' انہیں آرام سے کاٹنا چاہتی ہوں' سو ادھر آ نکلی۔ جوان بیٹے ہیں' خبر تک نہیں لیتے۔ کھانستی ہوں تو ناک بھوں چڑھا کر اور میری ٹوٹی پھوٹی کھاٹ کو اٹھا کر مکان کے پرلے سرے پر آدھی گری آدھی کھڑی دیوار کے گرم سائے میں رکھ دیتے ہیں۔ اپنی دلہنوں سے چمٹے پڑے ہیں۔ کم بختوں کو یہ بھی یاد نہیں کہ ان کی پریوں کو میں نے ڈھونڈا۔ پانچ سال ماری ماری پھرتی رہی۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ کے پاؤں چومے۔ اپنے گھر کا دانہ دنکا اکٹھا کر کے ان کے آگے لا ڈالا۔ مگر خیر بیٹا! زمانہ نازک ہے۔ اک بیٹی تھی' چودھویں رات کے چاند کی طرح من موہنی صورت والی۔ پچھلے مہینے ہسپتال میں مرگئی۔

نیا ڈاڈر آیا ہے۔ پانچ روپے مانگتا تھا' میرے پاس ایک چھلڑ (روپیہ) تھا' سو اس نے خبر نہ لی۔ روتی' بلکتی تڑپتی ختم ہوگئی۔''

ہسپتال نزدیک تھا۔ میں نے سوچا' بڑھیا کو گھوڑی پر ڈال کر وہاں تک لے چلوں مگر وہ گھوڑی پر کہاں بیٹھ سکتی تھی! اور پھر یہ گھوڑی جو پچھلے پاؤں پر کھڑی ہوگئی تھی! وہ راضی نہ ہوئی اور میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں اسے تسلی دے کر ہسپتال کے بڑے گیٹ پر پہنچا۔

پاس ہی بیری اور توت کے پودوں سے نحیف اور مریل ٹٹو اور بلند قامت مگر کمزور بیل بندھے تھے۔ ایک اونٹ پیٹھ پر خالی کجاوہ اٹھائے گردن بلند کئے ایک بیری کے پتے نوچ رہا تھا۔ آج تو مریضوں کی بھیڑ ہے' میں نے سوچا۔ ڈاکٹر کب میرے ساتھ چلنے لگا۔ اور پھر رستے میں اس کی جو تعریف سنی تھی۔ الٰہی توبہ!

میں نے گھوڑی ایک درخت سے باندھی اور برآمدے کی طرف بڑھا جہاں ڈاکٹر صاحب تشریف رکھتے تھے۔ ایک چوڑی میز پر بہت سے موٹے موٹے رجسٹر پڑے تھے۔ قلمدان کے پاس سرخ ربر کی کچھ نلکیاں سی دھری تھیں۔ برآمدے میں غضب کی بھیڑ تھی۔ بے چارے سیدھے سادے دہقان ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پر ہاتھ رکھ رہے تھے' گھٹنے چوم رہے تھے مگر وہ ایک اور صاحب سے قصبے کی نئی خبریں سننے میں مصروف تھے۔

لباس تو میرا ابھی اپنے علاقے کا تھا۔ لمبا سفید تہ بند لمبی کھلی آستینوں والی سفید قمیض' سفید پگڑی' ہاتھ میں چھڑی' مگر ایک چیز جس

سے مجھے خاص امتیاز حاصل تھا وہ عینک تھی۔ کالج کے زمانے میں عینک کی لت پڑ گئی تھی سو یہاں بھی نہ چھوٹی۔ ڈاکٹر صاحب میرے انگریزی طرز کے بال' سنہری عینک اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں دیکھ کر اٹھے۔

انہوں نے اپنی عینک کو ناک پر جماتے ہوئے کہا۔ "آیئے"

میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "آداب عرض"

"ایک عزیز سخت بیمار ہے' ذین کوٹ جانا ہے' یہاں سے تین میل دور' آپ تکلیف فرمائیں گے؟"

"ساتھ چلنا ہوگا مجھے یا بعد میں کسی وقت؟"

"میرے ساتھ اگر"

"تو میرا خیال ہے ان مریضوں کو دیکھ لوں۔"

"ضرور' میں انتظار کر سکتا ہوں۔"

"شکریہ"

ڈاکٹر صاحب پھر اپنے ساتھی کی طرف مڑے۔ "ہاں بھائی شام داس' پھر؟ پھر تم نے کیا کہا؟"

دبلے پتلے شام داس نے جواب دیا۔ "میں نے کہا کہ اگر میرا بس چلتا تو میں ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں سب کی گردنیں مروڑ کر رکھ دیتا۔"

"خوب' پھر انہوں نے کیا کہا؟"

"کہنے لگے اتحاد چاہیے اتحاد!" میں نے کہا۔ "بھائی آگ پانی میں بھی کبھی ملاپ ہوا ہے؟ ہندو اور مسلمان اور مل جل کر رہیں؟ اس دنیا میں تو یہ مرحلہ طے ہونے سے رہا۔ سب لوگ نئے سرے سے جنم لیں تو شاید یہ کام بن جائے۔"

"پھر؟"

"پھر جناب بہت کھسیانا ہوا۔ ہار مان گیا۔ کہنے لگا۔ "تم ساہوکاروں سے بات کرنا سوکا گھاٹا ہے۔ تم لوگ متعصب ہوتے ہو۔"

"واہ رے بیٹا! خوب کہی۔ ہم آزاد خیال لوگ ہمیں تعصب سے واسطہ؟ اب دیکھی آپ نے آج کل کے ہندوستانیوں کی ذہنیت! اور جو کل ان سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ان کے عقیدے بالکل الٹے ہوں گے۔ قلابازیاں کھاتی رہتی ہے ان کی ذہنیت۔ ہوا مخالف دیکھی اور رنگ بدل لیا۔"

ایک بزرگ صورت ادھیڑ عمر کا شخص جو کوئی ملک معلوم ہوتا تھا' برآمدے کے ستون کے پاس نمودار ہوا اور کہنے لگا۔ "ڈاکٹر جی!"

ڈاکٹر صاحب نے عینک اتار کر میز کے دراز سے ایک بیڑی نکالتے ہوئے کہا۔ "ہوں"

بزرگ نے اسی لجاجت اور حلیم الطبعی سے کہا۔ "بڑی دیر سے کھڑا ہوں۔"

"تو پھر میرا دماغ کیوں چاٹتے ہو۔ دو چار منٹ یہاں نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ اتنی جلدی تھی تو گھر ہی میں پڑے رہتے۔"

"میری بیٹی مر رہی ہے حضور! اس کے کوارٹر میں اسے جا کر دیکھ لیجئے یا کچھ دیجئے۔"

"زہر دوں؟ کیا دوں؟ کل والی میڈی سن کدھر ہے؟ دوائی؟"

"پلا دی تھی حضور۔"

"سب؟"

"ایک ہی خوراک تھی۔ کمپونڈر صاحب نے ایک ہی خوراک دی تھی۔"

اچھا ٹھہرو۔"

اور ڈاکٹر پھر سام داس کی طرف جھک گیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کرسی کو میز کے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاب ایک عرض ہے۔"

"فرمایئے۔"

"آپ کا رویہ غریب دہقانوں کے ساتھ اچھا نہیں۔ آپ کو تو ہر ایک سے مہربانی اور خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے۔"

ڈاکٹر نے ذرا اکڑ کر کہا۔ "تو حضور! میرا یہ تو فرض نہیں کہ ہر ایک کے آگے جھکتا پھروں۔ جو آئے اس کے لیے کرسی خالی کر دوں۔ دوائی مانگے تو اسے چار چار سیر کی بوتلیں لبالب بھر دوں۔ میرا فرض ہے نسخہ لکھنا اور دوسرے کی نبض دیکھنا' سو یہ ہوتا رہتا ہے۔ میں سرکار کا ملازم ہوں حضور سرکار کا۔"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ کسانوں کو اپنی سخت کلامی کا نشانہ بناتے رہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ غلطی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کی سیرت کا نمایاں پہلو مہربانی اور رحم ہوتا ہے۔ آپ کو میری یہ نصیحت یاد رکھنا چاہیے ورنہ اس کا پھل بہت کڑوا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب! یہاں کے لوگ صرف سادہ ہی نہیں' جاہل بھی ہیں۔ اگر یہ دہقان سادگی چھوڑ کر جہالت کی طرف مائل ہوں تو آپ کو سر چھپانے کو جگہ نہ ملے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔" آپ تو بہت گرم ہو رہے ہیں۔ میں تو غلام ہوں ان غریبوں کا۔ سرکار ملازم پبلک کا ملازم ہوتا ہے۔ دو چار باتیں ادھر ادھر کی کرلیں تو کوئی ہرج نہیں ہوا۔ آپ بے جا سختی کر رہے ہیں۔ ہاں بھائی ادھر آؤ' زبان نکالو۔ اٹھو"

ڈاکٹر مریضوں کی طرف متوجہ ہو گیا شام داس سلام کئے بغیر ڈاکٹر کی کرسی کے پیچھے سے بلی کی طرح کھسک گیا۔ اس کی خوف زدہ نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ آج میرا اسپتال آنا اس کے نزدیک ایک حادثہ ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر کے حلقہ احباب میں کھلبلی مچ جائے گی۔ کمپاؤنڈ کھڑکیوں سے سر نکالے مجھے تعجب اور غصے سے گھور رہے تھے۔ دہقان میری کرسی سے چمٹے پڑے تھے۔ وہ سب میرے ممنون نظر آتے تھے۔ میری نظر گیٹ پر پڑی تو وہ بڑھیا آتی دکھائی دی۔ میں اٹھا اور اسے بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر کی کرسی کے قریب لے آیا۔

ڈاکٹر چٹ پر چٹ لکھے جا رہا تھا۔ اس کی نبض پر ہاتھ دھرا' اس کا پیٹ ٹٹولا' اس کی زبان دیکھی' اس کی آنکھیں کھولیں۔ اور قلم فر فر کرتا ہوا تین چار چٹیں ختم کر کے ایک اور کاغذ پر چلنے لگا۔

"نام کیا ہے؟ عمر کیا ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ یہ لو جاؤ' پرسوں اور دوائی لے جانا۔"

یہ الفاظ بار بار اس کی زبان پر اس تیزی سے آتے تھے کہ بے چارے دہقان نام کی جگہ عمر اور عمر کی جگہ اپنے گاؤں کا نام بتا بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر کے ارد گرد حیرت بھری آنکھوں کا ہجوم تھا اور وہ ان کے اضطرابوں اور پریشانیوں سے بے پروا قلم گھستا جا رہا تھا اور سیاہی ضائع کر رہا تھا۔ مگر خیر' میرے الفاظ نے کچھ اثر تو کیا۔ اتنا تو ہوا کہ اب چار بجے سے پہلے ہی میرے ساتھ چل پڑے گا۔ بے چارہ مجھ سے خوف کھا گیا تھا۔ اس نے جانا یہ کوئی "پہنچ والا" آدمی ہے۔ بڑھیا کی باری آئی وہ کانپتی ہوئی ڈاکٹر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر نے صرف میری خاطر بڑھیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "زبان نکالو۔"

بڑھیا نے ذرا سی زبان ہونٹوں سے باہر نکالی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "اور نکالو۔"

بوڑھی نے زبان کو پھر اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ "بس اتی سی ہے ڈاڈر صاحب!"

مجھے بڑھیا کی اس بھولی بھالی بات پر بے اختیار ہنسی آئی۔ دو ایک مریض بھی ہنس پڑے مگر ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک بھی نمودار نہ ہوئی۔ میں نے بڑھیا سے کہا۔ "بڑی اماں! منہ کھول کر دکھا دے۔"

بڑھیا نے اس زور سے منہ کھولا کہ جبڑوں سے چیخ چیخ کی آواز آنے لگی۔ ڈاکٹر نے بڑھیا کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ وہ ڈاکٹر کے

چہرے کو ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھی اس وقت اس کی نظروں میں ڈاکٹر خدا کی حیثیت رکھتا تھا۔

"پانی پیتی ہوں حضور مگر پیتے ہی اور پیاس لگتی ہے۔ بخار بھی رہتا ہے۔ سر میں!"

ڈاکٹر نے اسے کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ "بس بس کافی ہے۔"

"کہاں لے جاؤں؟"

ڈاکٹر نے بغیر کوئی اشارہ کئے ایک اور مریض کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ادھر"

میں نے سوچا یہ ڈاکٹر تو فرعون ہے۔ یہ تو اپنے ہم جنسوں کو چیونٹیوں سے زیادہ وقعت نہیں دے رہا۔ اسے تو سمجھانا چاہیے۔ اور وہ افسانوں والا ڈاکٹر، وہ تو کوئی فرشتہ معلوم ہوتا تھا۔ ایسے ڈاکٹر ادھر کیوں نہیں بھیجے جاتے۔ ایسے ڈاکٹر ہوتے بھی ہیں دنیا میں؟

وہی بزرگ پھر برآمدے کے اس سرے پر پکارتا نظر آیا۔ "حضور! میری لڑکی۔"

ڈاکٹر نے اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے کہاں مر گئے تھے؟"

میں نے دیکھا بزرگ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا میز کے پاس آ پہنچا اور گرج اٹھا۔ "کیا بکا ہے تم نے؟ تمہیں شرم تو نہیں آتی؟ صبح سے میں تمہاری منتیں کر رہا ہوں اور تم سیدھے منہ جواب تک نہیں دیتے! تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو؟ میں اشارہ کروں تو یہ کسان تمہاری تمہاری...... بوٹیاں نوچ لیں۔ تم سمجھتے ہو یہ دنیا تمہاری غلام ہے؟ تم غلام ہو سمجھے؟ تم ہمارے غلام ہوں۔ کیوں ملک جی!"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ ڈاکٹر صاحب بہت ٹیڑھی راہ پر جا رہے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آج کس بدبخت کا منہ دیکھا تھا میں نے کہ مجھے ان بد دماغوں سے پالا پڑ گیا۔ اگر آپ ہر دو حضرات کا رویہ یہی رہا تو مجھے مجبوراً تھانے میں اطلاع دینی پڑے گی۔"

میں نے کرسی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "بھاگو۔ ابھی بلا لاؤ انہیں۔"

"تھانے والے بھی تم سے تنگ ہیں۔ کل ایک سپاہی کا بچہ وقت پر دوائی نہ پہنچنے سے جاں بحق ہو گیا۔ وہ جلے بیٹھے ہیں بے چارے۔ تھانے تک جاؤ تو سہی، تمہیں سمجھا دیں گے!"

بزرگ اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سر جھکائے برآمدے سے باہر نکل گیا۔ بزرگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کسان میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے۔ "ملک جی آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ آپ نے اس کی خوب خبر لی۔ آپ جیسے

پڑھے لکھے ہمارا ساتھ نہ دیں تو یہ لوگ تو ہمارے کپڑے بھی اتار لیں۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ آج آپ نہ ہوتے تو جانے یہاں کب تک بیٹھنا پڑتا۔"

غرض جس کے جی میں جو آئی' کہا گیا۔ ایک نوجوان جس نے ہاتھ پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ بولا اور ملک صاحب دس دن ہوئے میں یہاں آیا۔ یہ صاحب کہنے لگے کہ سوئی ڈالی جائے گی پھوڑے میں' تب اچھے ہوگے۔ میں مان گیا۔ مجھے اندر لے گئے پہلے جیب سے دس آنے نکال لیے پھر ایک اونچے سے پلنگ پر لٹا دیا۔ میرے ہاتھ کو ایک صاحب نے پکڑا۔ بڑے صاحب نے ایک سوا جس کے نیچے نالی تھی۔ میرے پھوڑے کے اندر داخل کر دیا۔ میں چلا اٹھا تو ڈاکٹر جی ہنسنے لگے۔ ہاتھ کانپ گیا اور سوا میری ہڈی میں گھس گیا۔ اب ادھر کھینچتے ہیں' ادھر دھکیلتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہنستے جاتے ہیں اور میرا جیسے دماغ خنجروں سے کاٹا جا رہا ہے۔ مجھے جیسے کسی نے شکنجے میں بھینچ دیا ہے۔ خدا خدا کر کے سوا باہر نکالا' مگر ٹوٹا ہوا۔ اس وقت نشتر سے میرا زخم چیر دیا۔ ہڈی سے وہ ٹوٹا ہوا پرزہ نکالا اور باہر آ کر کہنے لگا' "تمہاری ہڈی میں بھی دوائی چلی گئی۔ اب تم عمر بھر بیمار نہ ہوگے۔" یہ بھی کوئی شرافت ہے! اور اگر میں ٹھوڑی کے نیچے ایک گھونسا جما دیتا؟

مجھے نوجوان پر رحم آیا ادھر اس بڑھیا کا خیال آ گیا۔ تیزی سے کمپاؤنڈر کے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بڑھیا سامنے بوتل رکھے رو رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "کیوں اماں' رو کیوں رہی ہو؟"

بڑھیا نے اپنی نحیف آنکھیں اٹھائیں۔ بوڑھوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں تو خدا جانے دل کیوں ڈوبنے لگتا ہے اور کائنات خطرے میں کیوں نظر آتی ہے؟ اس بڑھیا پر اس "شفا خانے" والوں کو رحم نہیں آتا کیا؟

اس نے اپنے پھٹے پرانے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں بیٹا۔ رو رہی ہوں کہ یہ بابو دوائی نہیں دیتا۔ کہتا ہے چار آنے لوں گا۔ میرے پاس اکنی تھی وہ دے دی ہے' مگر اکنی اسے منظور نہیں۔"

میں نے قدرے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "کمپاؤنڈر صاحب!"

اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "فرمایئے"

"اسے دوائی دے دیجیے"

"آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ آپ ہسپتال کے ہر کام میں دخل دیتے پھرتے ہیں؟ دوائی دینا یا نہ دینا ہمارا کام ہے۔ آپ دوائی لینے آئے ہیں تو لے جائیں ورنہ اس کمرے سے باہر تشریف لے جایئے۔"

میں غصے میں جل گیا۔ "کم ظرف انسان! نہ میں اس کمرے سے نکلوں گا' نہ تمہارے کاموں میں دخل دینے سے رکوں گا۔ تم غریب کسانوں کا خون چوستے رہو اور میں دیکھتا رہوں؟ مجھے تو تم پر رحم آتا ہے۔ نوکری گئی تو بھیک مانگتے پھرو گے۔ اسے دوائی دے دو ورنہ"

کمپاؤنڈر نے سیلنڈر کو میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ کیا؟ ورنہ تم کیا کرو گے؟ تم کیا کر سکتے ہو؟"

مجھ سے نہ رہا گیا اور گھونسا تان کر اس کی طرف بڑھا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ بھی غضبناک بلی کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے جو ایک گھونسا جبڑوں میں جمایا تو میز کے نیچے اوندھے منہ جا گرا۔ ہسپتال کے ملازم' دہقان اور دوسرے لوگ دوڑے آئے۔ خود ڈاکٹر بھی آن دھمکا۔ دوائی لے کر بڑھیا کو دی۔ وہ مجھے ہزاروں دعائیں دیتی چلی گئی۔ ڈاکٹر نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں اس کی خودمختار حکومت میں ایک غیر ملکی حملہ آور ہوں۔ میں پھر کرسی پر آ بیٹھا۔

ڈاکٹر بدستور مریضوں کو دیکھنے میں مصروف رہا۔ چار بجے سے پہلے میں نے کوئی پانچ دفعہ اس سے کہا کہ اب مریض ختم ہو چکے ہیں' میرے ساتھ چلو مگر وہ اپنے ضد پر اڑا رہا۔ وہ اور بے نیازی سے کہہ دیتا۔ "شاید کوئی اور آ جائے۔" پھر "ملاپ" کا پرچہ دیکھنے لگتا۔

کوئی چار بجنے والے ہوں گے کہ ایک ملازم ڈاکٹر کے کوارٹر کی طرف سے بھاگا بھاگا آیا اور ہانپتا ہوا بولا۔ "حضور! ننھی رادھا کی حالت پہلے سے بھی خراب ہے۔ جلدی تشریف لائیے۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر فکر یا تردد کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے مگر اس نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ "میں آج نہیں جا سکوں گا۔ مجھے کل لے جائیے گا۔"

میں نے دو قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "مگر ڈاکٹر صاحب! میرا عزیز تو سخت۔"

"تو جناب میرا عزیز بھی سخت بیمار ہے۔ میں معذور ہوں۔"

میں اس کو کیا کہہ سکتا تھا۔ میں اسے کیسے مجبور کر سکتا تھا۔ میں کرسی پر سے اٹھا۔ بھوکی گھوڑی کی طرف دیکھا جو دردناک انداز میں ہنہنائی۔ ڈاکٹر کے کوارٹر پر نگاہ ڈالی۔ ایک ننھی سی لڑکی دروازے کے پاس گیند سے کھیل رہی تھی۔

میں نے ایک ملازم سے پوچھا جو ابھی ابھی قصبے سے آ رہا تھا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

"یہ رادھا ہے' ڈاکٹر جی کی لڑکی۔"

''یہ تو بھلی چنگی ہے! ڈاکٹر صاحب کو ذرا بلا دو گے؟''

''جناب ان کا حکم ہے کہ میں اندر جاؤں تو جو شخص آئے اُسے نوکری سے برخاست کر دیا جائے گا۔''

اور جب میں نے گھوڑی کو درخت سے کھولا تو کمپاؤنڈر اور ملازم برآمدے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میں نے رکاب میں پاؤں رکھا۔ گھوڑی اڑنے لگی مگر دور تک میں نے ایک کرخت قہقہہ اپنے پیچھے گونجتا سنا۔ گھر آیا تو میرا عزیز ڈاکٹر کے وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے بے ہوش پڑا تھا۔ صبح تک وہ سرد ہو گیا۔

بوڑھا سپاہی

انگلیوں سے بھویں اٹھا کر دیکھنے والا بوڑھا دہقان راستے میں ایک ابھرے ہوئے پتھر سے لاٹھی ٹکراتے ہوئے بولا۔ ''یہ بڑی لمبی کہانی ہے ملک جی! آپ سنیں گے تو تنگ آ جائیں گے۔ آپ بابولوگوں کے لیے ہماری باتوں میں کیا خاک دلچسپی ہوگی۔ ہماری باتیں ہوتی ہیں ڈھورڈنگروں کے متعلق یا میلے ٹھیلے پر کسی نے کسی کی پگڑی اچھال دی تو ہفتوں تک چوپال پر بیٹھنے والوں کا موضوع ہی یہی رہا۔ کسی کا کتا جیت گیا تو سارے جہان کے کتوں کی قسمتیں گن کر رکھ دیں اور ان سب کا سردار اپنے کتے کو بنایا۔ میں نے ملک جی! فوج میں بھی کام کیا۔ بڑی لام میں بھی رہا۔ فرانس سے زیادہ خوبصورت ملک میں نے کہیں نہیں دیکھا ملک جی! ہر طرف سبزہ زار' ہر طرف پھول ہی پھول۔ خوشبو میں بسی ہوئی ہوائیں' اور پھر لوگ اتنے خوش پوشاک' اچھے اور نرم مزاج کہ آپ ہندوستان سے جائیں تو وہیں کے ہو رہیں اور وہاں کا حسن دیکھ کر تو ہم توپوں کی دوں دوں اور بموں کے دھماکوں سے بھی بے پروا ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں تو خدا نے فرانس کو اپنی جنت کے نمونے پر بنایا ہے۔ مجھے زخمی ہونے پر ولایت بھیجا گیا۔ برٹن یا برٹین اس نام کا ایک شہر تھا۔ ایک سال وہاں ہسپتال میں رہا۔ آخر میرا بایاں بازو کاٹ دیا گیا ملک جی! دنیا خوب دیکھی ہے۔ اب دعا ہے کہ خدا ایمان نصیب کرے۔ آرام اور سکون سے مروں۔ میری کہانی تو یہی ہے ملک جی! اور آپ کیا سنیں گے!''

میں نے اپنے ایک دوست سے سن رکھا تھا کہ پھاگی کے گاؤں میں ایک بوڑھا دہقان ہے جس کا بایاں بازو کٹ گیا ہے۔ اس سے اس علاقے کا ایک ایسا رومان وابستہ ہے جو صدیوں تک زبان زد رہے گا۔ یوں تو اس رومان سے علاقے کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن اگر خود اس کی زبانی سنا جائے تو بے حد لطف آتا ہے۔ سنسان چراگاہ میں پھرتے پھرتے CE میں نے اس دہقان کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس نے ہزار بہانے بنائے۔ کترانے کی لاکھ کوشش کی لیکن میں نے کہا۔ ''بابا میں تو تیری کہانی سن کر ہی ٹلوں گا۔ میں اتنی دور سے آیا ہوں' اب یوں ہی واپس لوٹ جاؤں تو یہ دکھ مرتے دم تک مجھے ستائے گا۔ تم مجھے سنا دو تمہارا کیا بگڑے گا'' گائیں تو تمہاری چر رہی ہیں اور ابھی دوپہر کا وقت ہے۔ شام پڑے تم واپس گھر جاتے ہو گے۔''

بوڑھے نے ناک بھوں چڑھا کر اپنا سفید سر ہلایا اور بولا۔ ''اچھا چلئے اس بروٹے (بیری کا چھوٹا سا درخت) کے نیچے جا بیٹھیں۔ میری کہانی میں کوئی خاص بات تو ہے نہیں۔ چلیے!''

بروٹے کے نیچے اس نے اپنی چادر بچھادی۔ اس پر ہم دونوں بیٹھ گئے پھر اس نے ایک پوٹلی کھولی۔ ایک روٹی اور ایک بڑا سا پیاز نکالا۔ پیاز کو پتھر پر رکھ کر توڑا اور بولا۔ لیجئے کھایئے۔"

ہم دونوں نے اکٹھا کھانا کھایا۔ میں نے بڑی بڑی عظیم الشان دعوتوں میں حصہ لیا مگر اس سوکھی روٹی اور کڑوے پیاز کی لذت مجھے مرتے دم تک یاد رہے گی۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ فطرتاً بہت انس ہو جاتا ہے جنہوں نے کبھی محبت کی ہو اور یہ بوڑھا تو اس علاقے کا ہردلعزیز ہیرو تھا

کھانا کھا کر اس نے کہا۔"جوانی میں ملک جی! گلا ایسا چلتا تھا کہ اچھے اچھے گانے والے اپنے گھروں میں دبک بیٹھے تھے۔ اب پھیپھڑوں میں دم نہیں رہا لیکن پھر بھی عشق کی داستان میں اگر گانے نہ ہوں تو سارا مزہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ میں گاؤں گا ضرور لیکن آپ میرے اس جنون پر ہنسے گا نہیں۔ میں جب اپنی دکھ بھری کہانی بیان کرنے لگوں تو مجھے پرانے زمانے کا ہر منظر زندہ کرنا پڑتا ہے اور یہ صرف گانے سے ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ایک دو بار گلا صاف کیا اور ٹھیٹھ پنجابی میں ایک لطیف گیت گایا۔

"او میرے محبوب! تمہاری آنکھیں اس وحشی ہرن کی سی ہیں جو گہری گھاٹیوں میں اپنے بچوں کے ساتھ کلیلیں کر رہا ہو!"

"او میرے محبوب! تمہارے بال سورج کی ان باریک لانبی کرنوں کے سے ہیں جو مشرق کی طرف آسمان پر بکھر جاتی ہیں۔"

"او میرے محبوب! تمہارا چہرہ اس شرمیلے چاند کا سا ہے جو ساون کی راتوں میں گہرے بادلوں کے پیچھے سے باجرے کے نو دمیدہ پودوں کو جھانکتا ہو!"

"او میرے محبوب! تم کیا ہو؟ میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ تم مجھے کیوں چھوڑ گئے۔ تم کدھر چلے گئے؟"

اس بڑھاپے میں بھی اس کی آواز سے سنسان چراگاہ گونج اٹھی۔ گائیں گھاس چرنا بھول گئیں۔ چڑیاں بروٹے کی منحنی شاخوں پر دم سادھ کر بیٹھ گئیں دور ایک جھاڑی کے پاس ایک ننھا سا چرواہا آنکھیں ملتا ہوا جاگ اٹھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے گیت ختم کر کے میرے کاندھے پر ہاتھ دھرا اور بولا۔"ملک جی! آپ تو اداس ہو گئے۔ آپ اتنے نرم دل ہیں اور میری کہانی اتنی دردناک ہے! آپ تو گھبرا جائیں گے ملک جی! بہتر ہے آپ کہانی نہ سنیں۔"

میں نے کہا۔"بابا! میں نے کئی دردناک کہانیاں سنیں۔ کئی غمناک کہانیاں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ خود میں بڑا دکھی ہوں بابا! تم اپنی داستان کہتے جاؤ۔ محبت کی داستان میں سننے سنانے والے سب روئیں تو مزا آتا ہے۔ محبت کی خوراک آنسو ہیں بابا! تم تو اس

بات سے خوب واقف ہو گے۔"

بوڑھے نے اپنی کھردری پگڑی سے آنکھیں ملیں۔ ایک پتھر اٹھا کر ایک گائے کی طرف پھینکا جو فصل کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ "ملک جی! دنیا میں ہر شخص کے ساتھ محبت کی کوئی نہ کوئی کہانی چمٹی ہوتی ہے۔ ہیر رانجھے کے قصے کو ایک ایک گاؤں میں کئی کئی بار دہرایا گیا ہے اور دہرایا جا رہا ہے۔ کسے معلوم کتنے دلوں میں محبت کی چنگاریاں اب تک سلگ رہی ہیں۔ ان مسکراتے ہوئے چہروں کے پیچھے کون جانے کتنی فریادیں چھپی بیٹھی ہیں۔ میری کہانی کوئی نرالی کہانی نہیں بس ایک دکھے دل کی بپتا ہے۔ میں نے محبت کی! مجھ سے محبت کی گئی اور اچانک تقدیر نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ امیدوں کی ساری بساط الٹ گئی۔"

"اوہ ملک جی! آپ نے آج بجھی ہوئی راکھ پر انگارہ رکھ دیا تاکہ یہ پھر سے سلگ اٹھے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں نے زندگی میں صرف ایک بار اپنی کہانی ایک دوست کو سنائی تھی جس نے اسے اس قدر عام کر دیا کہ اب جدھر جاؤں مجھ پر انگلیاں اٹھتی ہیں۔ جو راز فاش ہو جائے اس پر دنیا حیران ہو جاتی ہے حالانکہ اس سے زیادہ بڑے راز لوگوں کے دلوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کے آگے اپنی کہانی بیان کر رہا ہوں۔ شاید آپ کے دل میں اس کہانی سے زیادہ دردناک کہانی چھپی ہو۔ عشق و محبت کا یہی تو زمانہ ہے! بہر حال آپ سنیں اور سن کر بھلا دیں۔ دوسروں کے دکھوں سے اپنا دل دکھانا بڑا مہنگا سودا ہوتا ہے۔"

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے کسان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تین جماعتیں بھی پڑھا ہوں۔ خط لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ میرے باپ کا ارادہ تھا کہ مجھے کسی سکول میں منشی بنا دیا جائے مگر میں پڑھنے کی بجائے کھیلوں میں زیادہ مگن رہتا تھا اس لیے تین جماعتیں پاس کرنے کے بعد باپ نے مجھے کھیتوں پر بلا لیا۔ اب جو ہل بیل سے واسطہ پڑا تو مدرسے کی یاد ستانے لگی مگر ہوتے ہوتے طبیعت بہل گئی۔ کبھی کبھی باپ کو ستانے کا موقع دینے کے لیے میں کھیتوں میں ہو آتا تھا۔ جوان ہوا خون میں گرمی آنے لگی۔ کوئی نوخیز لڑکی میرے پاس سے گزرتی تو میرا ہاتھ از خود میری پگڑی کی طرف جاتا اور اسے سر پر جماتا، طرے کو پھیلاتا، بالوں کی ایک لٹ رخسار کی طرف کھینچ لاتا اور ہاتھی دانت کے چمکتے ہوئے ننھے کنگھے کو کان کے پاس جما دیتا۔ میں کئی کئی گھنٹے اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھ کر گلی میں آنے جانے والوں کو گھور گھور کر دیکھتا اور جب آنکھوں کو کچھ حاصل ہو جاتا تو دیر تک میرے دل میں عجیب عجیب خیالات گھوما کرتے۔

یہاں پہنچ کر بوڑھے نے گلا صاف کیا اور گانا شروع کر دیا۔

"اے جوانی کے زمانے! تو ایک خواب ہے جو پو پھٹے آتا ہے اور پھر سورج کی کرنوں سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے!"

''تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے' تو ایک سایہ ہے جس کا کوئی پیچھا نہیں کر سکتا!''

''تو ایک بادل ہے جو برس کر خدا جانے کدھر گم ہو جاتا ہے!''

''تو ایک چنگاری ہے جو ایک بار بھڑک کر راکھ ہو جاتی ہے''

وہ تنکے سے زمین کریدتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ''ایک دن ہمارے دروازے کے سامنے سے ایک لڑکی سر پر ایک برتن اٹھائے ہوئے گزری اور میرے ہاتھ سے حقہ چھوٹ کر خاک پر گر گیا۔ کھانا کھانے کا وقت تھا لیکن میں ماں کی چیخ پکار سے بے پروا ہو کر وہیں بیٹھا رہا۔ آخر وہ دوپہر کو واپس آئی۔ اس نے مری طرف دیکھا اور ماتھے پر اوڑھنی جماتی اور سینے پر پھیلاتی ایک طرف مڑ گئی۔ میری رگیں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ چار دن میں نے پھر اس لڑکی کا انتظار کیا لیکن وہ نظر نہ آئی۔ آخر پانچویں روز وہ پھر اس گلی سے گزرتی دکھائی دی۔ سامنے ایک دکان تھی' وہ اس میں داخل ہو گئی۔ میں بھی وہیں پہنچ گیا۔ اس نے گڑ' نمک اور صابن خریدا' دکاندار کو ایک روپیہ دیا لیکن اس نے بجا کر واپس کر دیا اور کہنے لگا۔ ''یہ تو کھوٹا ہے۔''

وہ تعجب سے بولی۔ ''کھوٹا ہے؟''

میں نے پہلی بار اس کی آواز سنی۔ ''تو پھر یہ سودا رکھ لو۔ میں کل آ کر لے جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ نہایت مایوسی سے پوٹلیاں کھولنے لگی۔

میں نے دکاندار سے کہا۔ ''تو ازیار! وہ روپیہ مجھے بھی دکھانا ذرا؟''

''لڑکی نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پوٹلیاں کھولنا بھول گئی۔ وہ خوبصورت تھی یا نہیں' اس سے مجھے کیا واسطہ! وہ میرے دل اور دماغ پر نشہ بن کر چھا گئی۔ میں نے اس کا روپیہ انگلیوں پر بجایا تو پسلیوں کے اندر میرا دل بھی بری طرح دھڑکا! میں نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکالتے ہوئے کہا۔ ''لو۔ یہ تو ٹھیک ہے نا؟ یہ روپیہ میں ہرکارے کو دے کر ڈاک خانے میں چلوا لوں گا۔''

لڑکی نے مری طرف حیران ہو کر دیکھا اور بہت رسیلے لہجے میں بولی۔ ''مگر۔۔۔۔۔۔۔۔مگر میرا گھر تو نزدیک ہی ہے۔ پھاگی دو کوس تو ہے یہاں سے۔ میں کل سودا لے جاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ہرج ہے؟''

پھر میں دکان سے باہر نکل آیا اور دور دور تک اسے پوٹلیاں سر پر جمائے تیزی سے پھاگی کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔

پھاگی! پھاگی! خونخوار ظالم لوگوں کا گاؤں۔ قاتلوں کا گھر۔ گناہ اور جرم کا کارخانہ....... جہاں جھوٹ اور فریب کا بازار گرم

ہے۔ یہ لڑکی وہاں کی رہنے والی ہے! کیا آگ کے شعلوں میں پانی کی بوند سما سکتی ہے؟ کیا انگاروں کے ہجوم میں پھول کملا نہیں جاتا؟

"دوسرے دن میں پھاتگی جا پہنچا۔ چھوٹا سا گاؤں ہے' آپ نے شاید دیکھا ہوگا۔ میں ایک گلی سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔" کیسے آنا ہوا ملک جی؟"

میں نے مڑ کر جو دیکھا تو کانوں میں ایسی گونج سی پیدا ہونے لگی جیسے رات کے وقت کسی گھنے جنگل میں آندھی سے پیدا ہوتی ہے۔ میں نے مشکل سے کہا۔ "مجھے یہاں ایک کام تھا۔"

اس نے پوچھا۔" پانی وانی پئیں گے آپ؟ حقہ لاؤں؟"

"نہیں۔"

خدا جانے میں نے یہ کیوں کہہ دیا؟

اس نے پوچھا۔"اب واپس چلے جائیں گے آپ؟"

میں نے کہا۔"ہاں"

وہ بولی۔" اگر دن گزارنا ہو تو میرا گھر حاضر ہے۔ وہ سامنے چھپر والا مکان ہے ہمارا"

میں نے کہا۔"بہت اچھا۔"

وہ مسکرائی اور اپنے گھر کی طرف چلی گئی اور میں مبہوت و پریشان اپنے گاؤں کو واپس آ گیا۔"

بوڑھا کچھ دیر اس مغموم شخص کی طرح خاموش رہا جو آنسو روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ بھینچ لیتا ہے۔ آخر میری طرف دیکھا اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیا۔

"او چاندنی رات میں مست ہواؤں پر سوار ہو کر اپنے دیس کو جانے والی کونج!" "تیرا زخمی دوست ایک خاردار جھاڑی میں پڑا دم توڑ رہا ہے!"

"اس کا جسم خون سے آلودہ ہے اور اسے جنگلی چیونٹیاں چٹ رہی ہیں۔"

"او خوب صورت کونج! قافلے کو چھوڑ کر ادھر آ جا' کیوں کہ صرف تو ہی اس کے زخموں کو مندمل کر سکتی ہے!"

بوڑھا ضبط نہ کر سکا اور بے اختیار روتے ہوئے چادر میں منہ چھپا لیا۔

خاموش اور سنسان وادی! ہوا ساکن! اور بوڑھے کی دردناک آواز' جس میں کئی غم انگیز افسانے کروٹیں لیتے' نیلے آسمان کی

طرف رقص کرتے جا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے جو پلکوں ہی پر خشک ہو گئے۔ آنسو نہ پونچھنے میں جو لذت ہے اس کا احساس صرف ان رونے والوں ہی کو ہو سکتا ہے جنہوں نے سردیوں کی طویل راتوں میں روتے روتے تکیے بھگو دیے مگر پلکوں تک رومال نہ لے گئے!

بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ملک جی! آج میرے زخم چھل گئے۔ ان پر پھاہا رکھنے والے کب کے چل بسے! اب یہ مرتے دم تک رستے ہی رہیں گے۔ ملک جی! آپ نے ایک بوڑھے سپاہی کو ناحق چھیڑ دیا۔

آپ نوجوان ہیں' کم عمر ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ پرانے سازوں سے ایک بے ربط سی گونج کے سوا اور کچھ پیدا نہیں ہوتا! میں تو آپ کو معمولی معمولی باتیں سنا رہا ہوں' میرا کلیجہ چیر کر دیکھیں تو آپ کا دل دہل جائے اور پھر کسی غمزدہ شخص کو چھیڑنے کی جرات نہ ہو۔''

بوڑھے کی آواز سے غصہ نمایاں تھا!

''خیر' دو چار دن میں پھاگی جاتا رہا۔ ایک دوپہر اس کے ہاں بھی گزاری۔ اس کا باپ باہر گھاس کاٹنے گیا تھا۔ ماں اندر بیمار پڑی تھی۔ اس کا اک ننھا سا بھائی اپنے ہمجولیوں کے ہمراہ پرلے سرے پر گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ چھپر کے نیچے اس نے میرے لیے چارپائی بچھا دی۔ پانی لے آئی۔ حقہ تازہ کر دیا! اور اندر ماں کے پاس چلی گئی۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ اچانک میرے کانوں میں کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دودھ کا ایک پیالہ لیے کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

کہنے لگی۔ ''دودھ ہے پی لیجیے۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ بھوک ہو گی آپ کو؟''

اس کے بعد میں نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ اس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ کر میری چھاتی پر گر گیا اور تمام دودھ میرے کپڑوں میں جذب ہو گیا۔ وہ جھینپ سی گئی۔ میں نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں' ایسا ہو ہی جاتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ صرف آپ کے سامنے ایسا ہو گیا۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور اس وقفے میں جو باتیں ہم نے خاموشی ہی خاموشی میں ایک دوسرے کو سمجھائیں' ان کا ذکر میرے لیے تکلیف دہ ہو گا۔ مختصر یہ کہ ہم ایک ایسی بلندی پر جا پہنچے جہاں زبان کا کام آنکھوں سے لیا جاتا ہے۔''

دوسرے دن ہمارے گاؤں میں فوجی بھرتی کرنے والا صاحب آیا۔ باپ نے مجھے بھی پیش کیا۔ گورا چٹا جوان تو میں تھا ہی' صاحب نے جھٹ چٹھی لکھ دی اور کہا کہ آج ہی تم کوہاٹ چھاؤنی کو روانہ ہو جاؤ۔ میں نے سوچا پھاگی کیسے جاؤں گا! اور کافی دیر سوچتا

رہا۔ اور آخر مجھے اسٹیشن کی طرف روانہ کر دیا گیا اور جب میں نے ریل کے ڈبے میں بیٹھ کر یہ گیت گایا تو اچھے اچھے بزرگ مسافروں کی ڈاڑھیاں بھیگ گئیں۔

بوڑھا گانے لگا۔

''جب چڑیا دانہ دنکا چننے گھونسلے سے نکلتی ہے تو اس کے ہمراہ اس کا محبوب ضرور ہوتا ہے!

دوشیزائیں کنویں پر پانی لینے ہمیشہ اکٹھی جایا کرتی ہیں!

چاند کے ساتھ ایک تارا تم نے اکثر دیکھا ہوگا!

حیران آنکھوں والی میری پیاری حور! تو پھولوں میں سوئی ہوئی کون سے خواب دیکھ رہی ہے!

میں لڑائی پر جا رہا ہوں۔ شاید ہی واپس آؤں!

ہواؤ! ذرا ساجن کے دیس کو جانا اور اسے میرا حال سنانا!

بادلو! اپنا رخ ذرا پورب کی طرف پھیر لو اور میرے ساجن کے سر پر جا برسو!

سورج! اپنی نازک کھلنڈری کرنوں کو حکم دے کہ حیران آنکھوں والی میرے پیاری حور کے پاس میرے آنسوؤں کی مالا لے جائیں!

میں لڑائی پر جا رہا ہوں۔ شاید ہی پھر واپس آؤں!''

بوڑھا گا رہا تھا۔ پاس ہی دو گلہریاں اپنی لمبی لمبی دموں کے بال کھڑے کیے ننھی ننھی مضطرب آنکھوں سے بوڑھے کی لہراتی ہوئی آواز کو جیسے دیکھ رہی تھیں! اس کی آواز نے کائنات کو گھیر لیا تھا! گیت کی سحر انگیز لے کے اثر سے میں زور زور سے سانس لینے لگا! میں نے اس وقفے میں بہت سے خواب دیکھے۔ سنہرے حاشیوں والے دھندلے دھندلے خواب جو آسمانوں اور زمین کے بے پایاں خلا میں دھڑک رہے تھے! آواز کے سنہری دھاگے میرے تصورات کو اپنے اندر لپیٹ کر اوپر اٹھے جا رہے تھے۔ اوپر! جانے کس دیس کی طرف!

''آپ کیا سوچ رہے ہیں ملک جی؟''

میں چونک اٹھا۔

آپ تھک گئے ہیں شاید!''

''نہیں بابا! میں تمہاری آواز میں گم تھا۔ آگے چلو۔''

''ہاں تو ملک جی! ان دنوں بڑی لام شروع ہونے والی تھی۔ سن چودہ والی لام! میں تین سال فرانس اور مصر میں رہا۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں ملک جی! بم پھٹتے تھے' توپوں کے گولے ہمارے مورچوں کے پاس آ کر گرتے تھے' بندوقوں کی گولیاں ہمارے سر کے بالوں کو چھوتی نکل جاتی تھیں۔ کئی بار سنگینوں کی نوکوں نے ہمارے سینوں کو چھوا۔ گولیاں ہماری کھال اڑاتی مٹی میں دھنس گئیں۔ گرد و غبار' دھواں اور آگ' ہر طرف چیخیں' فریادیں۔ ہم فریادیں۔ ہم کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے مورچوں میں دو دو راتیں' چار چار راتیں بیٹھے رہے' سردیوں کے دنوں میں! ایک روز اندھیرے میں میرا بھاری بوٹ ایک مردے کی کھوپڑی پر پڑا اور اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

''ایک دفعہ میں نے ایک جرمن سپاہی کے دل میں سنگین گھونپ دی۔ وہ بے تاب ہو کر گرا اور بڑی مشکل سے اپنی جیب میں سے بھرے بھرے گالوں اور سنہرے گھنگھریالے بالوں والی ایک خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کی تصویر نکال کر اسے چوما' ہچکی لی اور مر گیا! ملک جی! میں نے اس سپاہی کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور دفن کرتے وقت تصویر اس کے زخمی دل پر رکھ دی۔

''کسی کو جان سے مار دینا ان دنوں ہمارا روز کا کھیل تھا۔ میں نے ان گنہگار ہاتھوں سے کئی سو آدمی جان سے مارے ہیں ملک جی! لیکن اس سپاہی کو قتل کر کے میں نے محسوس کیا کہ میرے زخم چھل گئے ہیں۔ میں دنیا کا سب سے بڑا گنہگار ہوں۔

''اسی دن بے خبری میں میں اپنے مورچے کے کنارے بیٹھا اپنی چراگاہوں کے خواب دیکھ رہا تھا کہ جرمن کیمپ کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ میرے کئی ساتھ مر گئے۔ میرا بایاں بازو بری طرح زخمی ہوا۔ درد کی شدت سے میں بے ہوش ہو گیا۔ ہم زخمیوں کو ولایت بھیج دیا گیا۔ ایک سال برٹین نامی شہر میں رہنا پڑا۔ بڑا خوبصورت شہر تھا ملک جی! آخر میرا بازو کاٹ دیا گیا اور مجھے پنشن دے دی گئی!

''جب ہمارا جہاز کراچی پہنچا تو میں پہلی گاڑی سے گھر روانہ ہوا۔ اسٹیشن سے اتر کر اپنے گاؤں آیا۔ لوگ مجھے پہچانتے ہی نہ تھے۔ آخر مجبوراً میں نے انہیں نام بتایا۔ انہوں نے کہا کہ ایک سال ہوا ہم تمہارا ماتم بھی کر چکے ہیں۔ کسی سپاہی نے انہیں لکھا تھا کہ میں لڑائی میں زخمی ہو کر مر گیا ہوں اور میری لاش ولایت بھیج دی گئی ہے۔ لاش ولایت کیوں بھیج دی گئی۔ یہ انہیں معلوم نہ تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور میرے ماں باپ؟''

انہوں نے بتایا کہ بے چارے پچھلے سال ہیضے کی وبا میں مر گئے

میں روتا روتا گھر آیا۔ ویران اور سنسان دیواروں پر گھاس' چاروں طرف ہولناک خاموشی' جنات کا مسکن!

"تمام شہر جمع ہو گیا۔ ہماری زمینیں تو بہت تھیں۔ ابھی تک وارثوں نے تقسیم نہ کی تھیں۔ میں وقت پر پہنچ گیا تو میرے رشتہ داروں کے کلیجے جل گئے!

"دوسرے دن میں نے پھاٹگی کی راہ لی۔ گاؤں کے پنگھٹ کے پاس پہنچا تو دور سے اس لڑکی کو آتا دیکھ لیا۔ راستے میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہ میرے پاس سے گزر گئی۔ اس کا شباب بہار پر تھا۔ میں نے چاہا کہ زور سے چیخوں اور اسے اپنے پاس بلا کر ایک ایسا گیت سناؤں جس سے وہ مدہوش کر میرے زانوؤں پر سر رکھ دے۔ وہ پانی بھر کر میرے پاس سے گزری۔ میری نظریں اچانک اس کے کانوں پر گڑ گئیں۔

"ان میں چاندی کے بندوں کی بجائے سونے کی بالیاں تھیں! اس کی شادی ہو چکی تھی!

"میرے کٹے ہوئے بازو میں ایک ٹیس سے اٹھی۔ میں گھبرا سا گیا! ادھر ادھر دیکھا! جی چاہا بھاگ جاؤں۔ اس بچاری کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ لیکن میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے کہا۔ "لڑکی! ذرا بات سننا!"

"وہ رک گئی۔ گھور کر مجھے دیکھا۔ گھڑے اک طرف رکھ دیئے اور میرے نزدیک آ گئی۔

"وہ میرے سامنے خاموش کھڑی ہو گئی۔ پہلے تو اس کی آنکھیں میرے کٹے ہوئے بازو پر جم گئیں' پھر میرے چہرے پر! وہ اتنی روئی' اتنی روئی کہ میں نے آج تک کسی انسان کو اس قدر روتے نہیں دیکھا۔ لیکن اس کی آواز نہ نکلی۔ اس کے ہونٹ پھڑ کتے رہے۔ نازک نتھنے لرزتے رہے! گلابی رخساروں کا رنگ پہلے زردی اور پھر نیلاہٹ میں بدل گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں دیر تک نہ تھمیں!

آخر اس نے پوچھا۔ "تم زندہ ہو؟"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں"

"وہ پھر خاموش ہو گئی۔

"میں نے کہا۔ جاؤ' تمہیں دیر ہو رہی ہے اور گاؤں سے کچھ لڑکیاں بھی پانی بھرنے ادھر آ رہی ہیں۔ تم جاؤ' تمہارا شوہر انتظار کر رہا ہو گا!"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "مجھے معلوم نہ تھا۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہ تھا۔ لوگوں نے کہا تم مر گئے ہو اور پھر لڑکی گھر کا سب

سے زیادہ مسکین مال ہوتی ہے۔ ماں باپ نے مجھے ایک بدبخت بیمار شخص سے بیاہ دیا۔ اب میں کیا کروں؟ مجھے کوئی طریقہ بتاؤ۔ خدا کے لیے مجھے کوئی طریقہ بتاؤ۔''

''اس کا سارا جسم بے طرح کانپ رہا تھا۔ اگر میں اسے سہارا نہ دیتا تو شاید وہ گر پڑتی!''

بوڑھا یہاں پہنچ کر خاموش ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کی بوڑھی آنکھوں میں ایک ایسی چمک ہے جو اکثر کسی بہت بڑے حادثے کی یاد سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ جو جھنجھوڑ کر کہنے لگا۔ ''میں اس کی زندگی کو تلخ ہوتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ تقدیر نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ میں تمہیں ہفتے دو ہفتے کے بعد مل جایا کروں گا۔ اب مجھے تم صرف ایک شناسا تصور کیا کرو ورنہ تم بہت دیر تک زندہ نہ رہ سکو گی۔''

ہم دونوں اکثر اس جھاڑی کے پاس یا اور کہیں ملتے رہے لیکن ہماری ملاقاتیں دنیا سے نرالی تھیں۔ میں اسے لڑائی کے حالات سناتا تھا اور وہ روتی رہتی تھی۔ جی تو میرا بھی چاہتا تھا کہ رو دے جاؤں مگر مجھے اس کی تسلی اور اس کا اطمینان منظور تھا۔

''دنیا کو ہمارے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ پندرہ سال یوں ہی گزر گئے۔ اس کا خاوند ایک سال پہلے مر چکا تھا۔ دوسرے سال وہ دو دن بیمار رہی اور اچانک چل بسی۔

''آخر لوگوں کو ہمارے تعلقات کا علم ہو گیا کیونکہ میں نے اپنی ساری زمینیں بیچ کر پھاگی کی شہزادی کے مزار پر ایک روضہ تعمیر کرایا۔ آپ نے پھاگی کے پنگھٹ کے پاس ایک بڑے گنبد والا روضہ نہیں دیکھا۔''

بوڑھے نے اس موقعے پر بالکل آنسو نہ گرائے بلکہ ایک گیت گانے کے لیے گلا صاف کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''مگر یہ بیل وغیرہ کس کے ہیں بابا؟''

''پھاگی کی شہزادی کے بچوں کی پرورش میں نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ گائیں چرا کر دودھ بیچتا ہوں اور انہیں کھلاتا ہوں۔ کیا یہ سب سے بڑی عبادت نہیں ملک جی؟''

اس کے بعد وہ اٹھا۔ چادر جھاڑ کر کاندھے پر رکھ لی۔ میرے ساتھ ادب سے مصافحہ کیا۔ گائیں اکٹھی کر کے آگے لگا لیں اور یہ گیت (کھوڑہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا کے ایک مشہور شاعر علی کے دوہے کا لفظی ترجمہ) گاتا پھاگی کی طرف چلا گیا۔

''آنکھوں نے رونے کی رسم شروع کی ہے جب سے میرا ساجن پردیس و سدھار گیا!

''تقدیر نے تدبیر کو شکست دے دی۔ خدا نے مجھے ساجن کی بے پایاں محبت ودیعت کر رکھی تھی!

''میں ہولناک سمندروں کو پیرتا ہوا وہاں جا پہنچا جہاں غموں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا!

تقدیر نے تدبیر کو شکست دے دی۔ خدا نے مجھے ساجن کی بے پایاں محبت ودیعت کر رکھی تھی!

''میں ہولناک سمندروں کو پیرتا ہوا وہاں جا پہنچا جہاں غموں کا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا!

''اے علی! میں نے بڑے شوق سے روزے رکھے لیکن آخر چاند بدلیوں میں چھپ گیا۔ شاید عید میرے نصیبوں میں نہ تھی!''

◆◆◆

ننھا مانجھی

کشتی کنارے سے لگی ہی تھی کہ ننھا ملاح اچھل کر میرے قریب آیا اور میرے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ''آج تو آپ میرے مہمان رہیں۔ خدا کے لیے بابو جی! رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے! آج رات میری جھونپڑی میں گزاریے۔ میرا بوڑھا باپ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا بابو جی! آپ ایک دن بھی نہیں نکال سکتے؟ اپنے غلام کے لیے آپ ایک دن بھی نہیں نکال سکتے؟ میں ابھی شہر جا کر گوشت لے آؤں گا۔ آپ.....''

ننھے مانجھی کی یہ فریاد اس معصوم دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی جس نے اس دنیا میں آ کر پانی اور صرف پانی ایسی مصفا چیز سے تعلق پیدا کیا تھا۔ جس نے اس کرے کے غلیظ الجھیڑوں سے بے خبر ہو کر ایک ایسی پاکیزہ فضا میں پرورش پائی تھی جس میں کسی چیز کو محبت سے دیکھنا جرم نہیں سمجھا جاتا۔

ننھے مانجھی کو میں دو سال سے جانتا تھا۔ مہینے میں ایک بار مجھے ضرور دریا پار جانا پڑتا تھا' اس لیے مجھے اس لڑکے سے اس قدر انس ہو گیا تھا کہ صرف اس کی کشتی پر سوار ہونے کی غرض سے اس کے انتظار میں میں نے کئی راتیں خنک ساحل پر گزار دی تھیں۔ بوڑھے ملاح مجھے سرپھرا سمجھنے لگے۔ مسافر مجھے بے کار نوجوان کہنے لگے لیکن مجھے اس لڑکے کی ننھی کشتی' پرانے چپو اور دمکتی ہوئی معصوم آنکھیں یاد آ جاتیں اور میں آرام سے پاؤں پھیلائے نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں نگاہیں دوڑاتا رہتا اور آخر ننھے مانجھی کے کالے چپوؤں کی مست چپ شپ سے چونک اٹھتا۔

وہ مجھے دیکھ کر بے اختیار ہنستا اور جب کشتی کو باندھ کر میرے پاس آتا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوتیں۔ وہ میرے سامنے بولنے کی کوشش کرتا لیکن احساسات کے طوفان سے اس کی زبان گنگ ہو جاتی۔ وہ صرف ہنس دیتا اور خوشی کے آنسو اس کے سانولے رخساروں پر تھرکتے ہوئے نیچے گیلی ریت میں کھو جاتے!

میں اسے ہمیشہ مقررہ نرخ سے دگنی تگنی رقم دے دیا کرتا تھا اور ہر مہینے شہر سے اس کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے آتا۔ اب کے میں اس کے بوڑھے باپ کے لیے سات گز کی گلابی پگڑی لے آیا۔ جسے دیکھ کر اس کی شفاف آنکھیں اور زیادہ چمکنے لگیں!

''بابو جی! اگر آج آپ میرے گھر نہ آئے تو میں کشتی چلانا ہی چھوڑ دوں گا۔''

ننھے مانجھی نے آستین سے آنسو پونچھے اور میرا سوٹ کیس سر پر رکھ کر ایک طرف چل پڑا۔ مجھے اس دن دفتر میں حاضر ہونا تھا۔ میں نے اسے ہر ممکن طریق سے سمجھایا کہ "بھائی میں نوکری سے برخاست ہو جاؤں گا۔ مجھ پر جرمانہ ہو جائے گا۔ وہ مجھے پھر او ٹرنہ آنے دیں گے۔" لیکن اول تو وہ ان شہری اصطلاحات کو سمجھنے سے قاصر تھا اور اگر اس کے معصوم دل میں ان خطرات کا کچھ احساس پیدا بھی ہوتا تو اچانک مٹ جاتا اور وہ اپنے ضعیف باپ کا واسطہ دے کر مجھ سے کہتا کہ آج ضرور میرے مہمان بنئے۔ مجبوراً میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا اور وہ ایک نہایت لذیذ تقریر کرنے میں مصروف رہا۔

"بابو جی! وہ سامنے دھندلی سی ہے نا؟....... اسی میں ہماری جھونپڑی ہے۔ میرا باپ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے بال آٹے کی طرف سفید ہو گئے ہیں۔ وہ کھانا کھاتا ہے تو ایک ایک لقمہ چبانے میں بہت وقت لگا دیتا ہے' پھر بھی چبا نہیں سکتا بابو جی! ہم نے ایک بکری پال رکھی ہے' میں جا کر اس کا دودھ دوہوں گا' پھر اس میں روٹی بھگو کر باپو کو کھلاؤں گا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا' جھونپڑی کے دروازے پر یا اندر کھاٹ پر' جو چیز اس پگڈنڈی سے گزرتی دکھائی دے گی وہ اسے دیکھ کر سمجھے گا کہ میرا ننھا آ گیا۔

"رات کو میں اس کے پاؤں دباتا ہوں' لیکن بابو جی! ہڈیاں دبانے سے آرام کیا ملتا ہوگا۔ بابو جی ایک دن میری کشتی میں ایک لاش ڈال دی گئی۔ مجھ سے کہا کہ اسے اس پار لے چلو۔ میں نے کنارے پر پہنچ کر اس کے منہ سے کپڑا ہٹایا تو وہ ایک بوڑھا سفید بھنوؤں والا بزرگ تھا۔ میں نے اس کے رشتہ داروں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اپنے بیٹے کی شادی پر جاتے ہوئے راستے ہی میں مر گیا بے چارہ!"

"بابو جی! اس دن سے مجھے بھی یہ خیال آتا رہتا ہے کہ کسی دن اگر میرا باپ بھی مر گیا تو میں کیا کروں گا؟ پھر مجھے چپو چلانے اور ماہیا گانے میں کچھ لطف نہ آئے گا بابو جی۔ اپنی ماں تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔ میرے بچپنے ہی میں سدھار گئی۔ باپو کہتا ہے کہ وہ بہت اچھی تھی۔ دریا کنارے اس کی قبر ہے۔ میں اکثر وہاں جا کر اس پر اگی ہوئی گھاس توڑ توڑ کر کھایا کرتا ہوں۔ اور بابو جی اس گھاس میں سرخ سرخ بیروں اور سفید سفید توتوں سے زیادہ مٹھاس ہوتی ہے۔"

اس نے پہلی مرتبہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کے ماں باپ جیتے ہیں بابو جی؟"

"باپ تو مر گیا ہے مانجھی! اماں زندہ ہے' تمہارے باپ کی طرح بوڑھی ہے۔"

"اللہ کرے جیتی رہے آپ کی ماں۔ آپ بھی دعا کریں کہ خدا کرے میرا باپ بہت دیر تک جیتا رہے۔ بابو جی! ہمارا خدا آسمانوں پر رہتا ہے نا؟"

بچوں کا خیال خدا کی طرف ہو جائے تو وہ عجیب عجیب نکتے نکالتے ہیں۔ اس لیے میں نے جواب دیا "ہاں!"

پھر اس نے ذرا رک کر پوچھا۔ "اور اپنے بندوں کو زمین پر پھینک دیا؟"

"ہاں وہ سب سے اعلیٰ' سب سے اونچا ہے۔ اسے اونچا ہی رہنا چاہیے۔"

"انسان کو زمین پر بھیج کر پھر واپس کیوں بلا لیتا ہے؟"

"نہ بلائے تو یہ دنیا جلدی ہی پرانی ہو جائے ماجھی۔"

اس جواب سے اس کی تسلی ہو گئی۔

چلتے چلتے وہ کئی جگہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑا اور جب میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو بولا۔ "بابو جی! جی چاہتا ہے آج تو ہنستا ہی جاؤں۔ آج تو میرے لیے عید ہو گئی۔ میرا باپو تو خوشی سے رو دے گا۔ بابو جی! ہمارے ہاں آپ جیسے لوگ کب آتے ہیں؟"

میں حیران تھا کہ ماجھی کی اس بے پناہ محبت کا بدلہ کیسے اتاروں گا؟ یہ تو میری پوجا کرتا ہے! میں سوچتا گیا کہ اس کا باپ مجھے دیکھ کر مسرت سے کانپے گا۔ جھک کر میرے ساتھ مصافحہ کرے گا۔ مجھے چارپائی پر بٹھائے گا۔ خود دیوار سے پیٹھ لگا کر زمین ہی پر بیٹھ جائے گا۔ ماجھی کو قصبے سے گوشت اور سوجی لانے کو کہے گا اور پھر شام کو ہم تینوں اکٹھا کھانا کھائیں گے۔ غریبوں کا مہمان بننے میں جو لذت ہے وہ امیروں کے مہمان بننے میں کہاں! غریبوں کے ہاں سادگی' اخلاص اور حقیقی مسرت! اگر ساری دنیا غریب ہوتی' ساری دنیا کی معاشرت کا معیار اس ننھے ماجھی کے باپ کا سا ہوتا' تو کتنی خوش قسمت ہوتی یہ کائنات! یہ زہریلی گیس' یہ بجلیاں برساتے ہوئے ہوائی بھوت' یہ آگ اگلنے والی آہنی ڈائنیں' یہ کلیجے بھونتی ہوئی چمکدار نالیاں' یہ گردنیں اڑاتی ہوئی تلواریں' یہ رگیں کاٹتے ہوئے نیزے' یہ سب نابود ہوتے! سادگی کی میٹھی میٹھی پھواریں' سکون و اطمینان کے خنک و لطیف جھونکے! زندگیاں فطرت کی ہلکی ہلکی تھپکیوں' دھیمے دھیمے ہلکوروں سے لطف اندوز ہوتیں۔ اور پھر' پھر انسان ہمیشہ جینے کی خواہش کرنے میں حق بجانب ہوتا! لیکن اب اب تو!

ماجھی کی آواز آئی۔ "بابو جی!"

میرا سلسلہ خیالات ٹوٹ گیا۔ ہوائی قلعے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے۔

"بابو جی! وہ ہے ہماری جھونپڑی! دیکھی آپ نے؟ ببولوں میں پھنسی ہوئی۔ وہ جس کی دیوار کا ایک حصہ گر چکا ہے!... ہاں وہی!"

دروازہ کھلا تھا۔ دروازے کے ساتھ ایک بکری بندھی تھی جو گردن اٹھائے شاید ماجھی ہی کی منتظر تھی۔ اس کے پاؤں میں زیادہ تیزی آ گئی۔ وہ دوڑتا ہوا وہاں پہنچ جاتا مگر مجھے مڑ کر دیکھتا اور رفتار کم کر لیتا تھا۔ وہ آج کتنا خوش تھا۔ کشتی سے اتر کر جھونپڑی تک آنے کے دوران میں اس کے معصوم لبوں کے کانپتے ہوئے گوشے کھلے ہی رہے اس کی آنکھیں مسکراتی ہی رہیں! اس کے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے درمیان پسینے کے دو چار قطرے شاید شدت احساس کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔ بکری اسے دیکھ کر زور زور سے ممیائی! اس نے سوٹ کیس دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور بھاگ کر اندر گیا۔

''باپو...... باپو...... باپو جی...... باپو...... باپو!''

میں اندر گیا۔ بوڑھا سو رہا تھا۔

''سونے دو ماجھی! آرام کرنے دو۔''

''لیکن بابو جی! باپو اس وقت پہلے تو کبھی نہیں سویا کرتا تھا!''

جب میں نے نبض پر ہاتھ رکھا تو سامنے دیوار کے شگاف مجھے گھورنے لگے! میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ میں نے کانپ کر ماجھی کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور کہا۔ ''آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

یہ کہہ کر وہ بھی رونے لگا!

میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا باپو چل بسا۔''

وہ پوری قوت سے میرے بازوؤں کی گرفت سے چھوٹ کر اپنے باپ پر جا گرا۔ اس کی لاش کو چیخ چیخ کر جھنجوڑا۔ اس کی آنکھیں کھول کھول کر دیکھیں۔ اس کا سر اٹھا اٹھا کر ہلایا۔ چارپائی کے پایوں سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر ماتھا زخمی کر لیا۔

میں نے کہا۔ ''ماجھی...... بہت نہ روؤ۔''

لیکن اس نے مجھے ایسی نظروں سے گھورا۔ جیسے ساری دنیا میں ایک میں ہی اس کا دشمن ہوں میں نے سمجھا۔ اس کی دھڑکتی ہوئی آنکھوں سے اس کی روح نکل کر مجھے دبوچ لے گی! ننھے ماجھی کی محبت اب بوڑھے ''باپو'' کی ٹھنڈی اور اکڑی ہوئی لاش پر مرکوز ہو چکی تھی! وہ بابو کو بھول گیا تھا۔

ماجھی کو اب میں اپنے گھر لے آیا ہوں لیکن کشتی چلانے یا مجھ سے باتیں کرنے کے بجائے اب وہ ایک کمرے میں پڑا میری لائی ہوئی سات گز کی گلابی پگڑی کو گھورتا رہتا ہے۔''

◆◆◆

ہرجائی

جمعرات کے دن مجھے اس کھیت کو ہاتھ لگانا تھا جو ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ گاڑی کی ہر وقت کی آمد و رفت سے تھکے ہاروں کا دل وہاں قدرتاً بہلا رہتا ہے۔

میں بدھ کو سویا تو آدھی رات کو ہی آنکھ کھل گئی۔ کروٹیں بدلیں' آنکھیں زور زور سے بھینچیں' اٹھ بیٹھا' لیٹ گیا' گھٹنے چھاتی سے لگائے' پاؤں پھیلا دیئے مگر نیند عنقا تھی۔ یہ نیند کیا چیز ہے؟ میں نے سوچا' یہی سکون' اطمینان قلب۔ لیکن رونے والے بھی تو سو جاتے ہیں۔ پھر نیند کیا ہے؟ انہی الجھنوں میں مشرق سے پو پھٹنے کے آثار نمودار ہوئے۔ ایک موہوم سا دھندلا کا افق کے ساتھ ساتھ ابھرتا معلوم ہوا۔ میں نے درانتی ہاتھ میں لی' رسی کمر سے لپیٹی' پانی کا پیالہ پیا اور دیہاتی گیت گنگناتا ہوا ہولے سے گاؤں کے باہر نکل گیا۔

اوس سے بھیگے ہوئے پودے یوں جھکے ہوئے تھے جیسے مراقبے میں ہیں۔ گھاس نکھری نکھری تھی۔ نم آلود مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سے دماغ نئے نئے بہشت ایجاد کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مستقبل کی تاریکیاں خیالی مسرت کی ہلکی ہلکی کرنوں سے آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی ہیں۔ آسمان کی لامحدود وسعت' افق کی لامتناہی لکیر' سبزہ زاروں کا بے پناہ پھیلاؤ' میری پھڑ پھڑاتی ہوئی مضطرب اور بے قرار روح کے لیے حبس ثابت ہو رہے تھے۔ میں کہیں اڑ جانا چاہتا تھا۔ سامنے شفق کی بوقلموں رنگوں والی آسمانی وادیوں میں سما جانا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسکرانا چاہتا تھا اور غم.....؟

غم مجھے انسانی زندگی کے کلیجے میں ایک کانٹے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور یہ غم کھانے والے لوگ! مسرتوں اور بشاشتوں کے سنہرے صفحوں پر بدنما دھبے' رومان اور ارضی خلد زاروں کے شفاف ماتھوں پر کلنک کے ٹیکے! یہ لوگ جینے کے قابل ہی نہیں میں سوچ رہا تھا وہ کھیت جن میں اگے ہوئے پودوں کے زرد خوشے سر جھوڑائے زمین کو دیکھ رہے تھے' وہ درخت جن کی فلک بوس چوٹیوں پر چیلوں کے گھونسلے منہ کھولے آسمانوں کو گھور رہے تھے' وہ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں جن کی چھاتیاں صدیوں سے روندے جانے کے باوجود ابھری ہوئی تھیں۔ میری مسرت کی اٹھکیلیوں اور میرے جذبہ انبساط کی آسمان پیمائیوں کے لیے یہ دنیا! کوئی اور دنیا چاہیے تھی میرے لیے کوئی نئی دنیا جہاں رنگ ہوتے' راگ ہوتے' حسن ہوتا' عشق ہوتا' شادکام عشق یہ تلخ کام عشق نہیں جس کی قسمت میں آنسوؤں اور آہوں کے سوا کچھ نہیں

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے درانتی سے دس بارہ پودے کاٹ کر دور پھینک دیئے' سبزے کو نوچ کر ہوا میں اڑا دیا۔ پگڈنڈی کو چھوڑ کر چلنے لگا۔ گھونسلوں پر پتھر پھینکے۔ چیلیں' پھڑ پھڑاتی ہوئی دھندلی فضا میں تیرنے لگیں اور میں خوشی سے ناچتا کودتا ریل کی پٹڑی کے قریب ہوتا گیا۔

کھیت کے پاس پہنچ کر میں نے کمر سے رسی کھولی' لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرا' درانتی کے چمکتے ہوئے دندانوں کی طرف دیکھا اور یہ گیت الاپتے ہوئے جوار کاٹنے لگا۔

''اساں نال سجن دے لائیاں اکھیاں رنگ بھریاں''

سبز رنگ کے ننھے ننھے کیڑے پتوں کے ساتھ چمٹے تھے۔ بھیگی بھیگی زمین پر عجیب الخلقت چیزیں رینگ رہی تھیں۔ یکا یک میرے کانوں میں گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ روک لیا اور اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ مغرب کی طرف افق کے پاس دھوئیں کا ایک مرغولہ ہوا میں بل کھاتا معلوم ہوا اور پھر کالے کالے انجن کی ابھری ہوئی چھاتی' ماتھے میں ایک سفید چمکتی ہوئی آنکھ' ہوا میں لہراتی ہوئی زلفیں' زمانہ قدیم کی داستانوں کا دیو جو زمین کے سینے کو لتاڑتا دھاڑتا ہوا بڑھا آ رہا تھا! دھم دھپ! دھم دھپ...... گاڑی بہت نزدیک آ گئی۔ ڈرائیور نے اپنا سر باہر نکالا۔ کالا منہ' سفید دانت' اڑتے ہوئے بال اور میلے ہاتھ۔ پھر چھکڑے' ایک انگریز' ایک میم چھاتی کے ساتھ کتا لگائے اور پھر ایک ہندوستانی صاحب' موٹا سا سگار' بوڑھی خاتون' اخبار کا پھڑ پھڑاتا ہوا پرچہ اور پھر ایک دہقان' پاس ہی کانپتا ہوا حقہ' ایک دہقانی عورت' دو بچے۔ میری نظر نہ جم سکی۔ یکا یک میرے پاس آم کی ایک گٹھلی آ گری اور پھر ایک کمرے میں ایک بچہ سفید باہوں کی طرف بھاگتا معلوم ہوا۔ میرے ساتھ مذاق کیا تھا شریر نے' یہ ریل بھی کیا ایجاد ہے ولایت والوں کی! پل بھر میں دھوئیں کے سوا اور کوئی نشان نہ تھا۔ میں سوچنے لگا۔ یہ صاحب لوگ اور یہ ہندوستانی بزرگ اور یہ دہقان' یہ اکٹھے ایک کمرے میں کیوں نہ بیٹھے' دہقان بھی انسان تھا آخر وہ نرم نرم گدیلوں اور ٹھنڈے ٹھنڈے پنکھوں کے نیچے کیوں نہ بیٹھ سکا؟ صاب کو بدبو آتی ہے اس کے کپڑوں سے؟ کیا صاحب کو متعفن شراب' غلیظ سگار اور بدبودار سگرٹ سے نفرت نہیں ہوتی؟ نہیں! انسانوں کو انسانوں سے نفرت کیوں ہے؟ دہقان کے پاس پیسہ نہیں اور صاحب کی جیب میں چاندی ہے۔ پیسہ! پیسے کی دنیا! مگر مجھے کیا...... مجھے کیا؟ میں نے سوچا...... آخر مجھے کیا؟ میں درانتی ہاتھ میں گھماتا ہوا کھیت کی جانب بڑھا۔

ایک باریک سی آواز آئی۔ ''او بھائی!''

میں نے پلٹ کر پٹڑی کے اس پار دیکھا' کچھ نظر نہ آیا۔ ''مجھے کس نے بلایا تھا؟''

ادھر بائی ' ادھر آنا ذرا۔"

سامنے کھیت سے ایک لڑکی کا سر نمودار ہوا۔ سر کھلا تھا اور رنگ نکھرا نکھرا۔ بس۔ دوری کی وجہ سے میں اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ میں نے درانتی کٹی ہوئی جوار پر پھینک دی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا پگڈنڈی کو عبور کر کے کھیت کی جانب بڑھا۔

لڑکی جوار کو رسی سے باندھ رہی تھی۔ اس کوشش میں اس کے کالے بال جن میں سنہری رنگ کی ہلکی سی جھلک تھی' جوار کے شبنم آلود پتوں کو چھو رہے تھے۔ کالا کرتا اور کالا تہبند۔ میرے دل میں کوئی خیال نہ آیا۔ کوئی چبھن نہ اٹھی۔ ایسے واقعات مجھے کئی بار پیش آ چکے تھے۔ جوار اٹھا کر اس کے سر پر رکھنی ہوگی۔ ایک لڑکے سے اسے اور کیا کام ہو سکتا ہے؟

میں نے نزدیک جا کر پوچھا۔ "کیا کام ہے؟"

لڑکی نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہ جوار میرے سر پر رکھ دو۔"

وہ کتنی خوش گوار گھڑی تھی جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ابھرا ہوا ماتھا' تیکھی ناک' نازک نازک' باریک باریک' سرخ سرخ لب' لبوں کے گوشوں پر بہت ہی خفیف سیاہی اور آنکھیں؟ جیسے ان میں سے روشنیوں کے چشمے چھلک پڑیں گے۔ انچ انچ بھر ٹیڑھی اور گھنی پلکیں' نچلے ہونٹ کے عین نیچے پچکی ہوئی ٹھوڑی کے حسین گڑھے کے کنارے پر ایک گول سیاہ تل۔ وہ مسکرائی اور اس کے چہرے پر گول لہروں کے خفیف نشانات ابھر آئے۔

"کیا ہاتھ بٹاؤ گے میرا؟"

مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ میں ایک لڑکی کو دیوانوں کی طرح گھور رہا ہوں۔ میں نے اپنے جسم کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "ضرور"

میرے تمام جسم کو نیند سی آ گئی تھی۔ میں نے جوار پر ہاتھ رکھا۔ بازوؤں کی طاقت کدھر گئی تھی؟ شرمندہ نہ ہونا پڑے اس لڑکی کے سامنے! میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرا' گلا صاف کیا اور پھر جھکا' لڑکی بھی جھکی۔ اس کا چہرہ جوار کے پتوں میں ڈوب گیا۔ کتنی بے پروا لڑکی تھی! اسے اپنے چہرے کی رعنائی کا احساس تک نہیں! اور اگر اس کے گالوں پر کوئی خراش پڑ جائے تو؟

میں نے ایک جھٹکے سے جوار اس کے سر پر رکھ دی۔ اس کے قدم دو ایک دفعہ ڈگمگائے۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"یہ درانتی بھی کہیں اٹکا دو۔"

میں نے درانتی رسی کے ساتھ اٹکا دی۔ وہ دو قدم چلی پھر رک کر پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے؟"

''سامنے کوٹالہ میں۔''

میں نے جواب دیا۔''ہاں۔''

یہ جھوٹ تھا۔ میری جوار ابھی میرے بیلوں کے لیے ناکافی تھی۔

''تو چلو مجھے بھی ادھر ہی جانا ہے۔''

کتنا اچھا خدا! اتنا اچھا! اتنا مہربان! اور اس کی یہ پیاری زمین جس پر یہ لڑکی کھڑی تھی۔ کتنی رسیلی زمین! میں سرپٹ دوڑا۔ آن کی آن میں جوار اٹھا کر سر پر رکھی اور لڑکی کے ساتھ چلنے لگا میرے جسم میں گرمی سی پیدا ہو گئی تھی۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں' آنکھیں جل رہی تھیں' ہونٹ جل رہے تھے۔ یہ کیسی آگ ہے اللہ میرے! یہ تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم۔ انہیں چوم لینے کو جی کیوں بے تاب ہو رہا ہے؟

اس نے پوچھا۔''خاص کوٹالہ کے رہنے والے ہو؟''

میں نے جواب دیا۔''خاص کوٹالہ کا۔''

باتونی لڑکی۔ میں نے سوچا۔ لڑکیاں تو بہت کم گو ہوتی ہیں۔

دس بارہ قدم ہم دونوں خاموش رہے۔ آخر میں نے پوچھا۔''تمہارا گاؤں کونسا ہے؟''

''ہے تو کوٹالہ ہی۔ مگر ابا گاؤں چھوڑ کر باہر آ بسا ہے۔ کیوں کہ زمینیں دور ہیں۔ وہ سامنے دو مکان نظر آ رہے ہیں نا' وہ ہمارے ہی ہیں۔''

''اچھا' تو پھر یہ مکان تو شاید راستے ہی میں پڑتے ہیں۔''

''ہاں۔ تم صبح وہیں سے گزرے تھے؟''

''ہاں''

''میں نے تو نہیں دیکھا تھا تمہیں۔''

''اتفاق کی بات ہے۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔

اس نے پوچھا۔''کل بھی آؤ گے؟''

''روز آیا کرتا ہوں۔''

''ادھر ہی؟''

''ہاں ادھر ہی۔''

''تو میں تمہارا انتظار کیا کروں گی۔''

مسرت کے جوش میں بڑی مشکل سے میرے منہ سے نکلا۔ ''اچھا۔''

میں یہ سمجھا' میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے' ہوا میں تھرک رہے ہیں۔ یہ دنیا میرے لیے ہی ہے۔ یہ کائنات میری ہے' میری اور اس لڑکی کی۔

اس نے پھر پوچھا۔ ''بہت تھوڑی جوار کاٹی ہے تم نے؟''

''ہاں''

''کتنے جانور ہیں؟''

چار بیل ہیں''

''گائے وائے؟''

''کچھ نہیں''

''کیوں''

''ایک تھی' مر گئی تھی بے چاری پچھلے مہینے۔''

دودھ چھاچھ کی تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔''

''بہت''

پھر خاموشی چھا گئی اور اس کا مکان قریب آیا تو اس نے میری طرف مڑ کر کہا۔ ''صبح یہاں سے گزرتے وقت چھاچھ پی جایا کرو' سمجھے؟''

میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ میں آگے بڑھنا نہ چاہتا تھا بلکہ وہیں بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ مری دنیا سمٹ سمٹا کر اس دالان میں جمع ہو گئی تھی جہاں اس نے اب جوار پھینک دی تھی' لیکن میرا چلے آنا تو ضروری تھا۔ گاؤں سامنے تھا مگر ہر قدم پر ایک لق و دق صحرا کا

گمان ہوتا تھا۔گاؤں سے نکلتے وقت جو خیالات تھے وہ یک قلم نابود ہو گئے۔کائنات میرے لیے وسیع ہو گئی۔ہر شے میں حسن جھلکنے لگا۔اور غم!۔۔۔۔۔۔۔غم کی چبھن سے دل کو لذت سی محسوس ہو رہی تھی۔طبع انسانی بھی کتنی تیزی سے رنگ بدلتی ہے!اس لڑکی نے کیا قیامت ڈھادی ہے مجھ پر؟میں حیران تھا!اس لڑکی کی پہلی ملاقات میں مجھے حیرت کے سوا ملا ہی کیا تھا!پھر آخر میں اپنے گاؤں میں پہنچا۔جوار تھوڑی تھوڑی کر کے ہر ایک بیل کے آگے ڈال دی'وہ پیٹ بھر کر کھانے والے سر اٹھا کر میرا منہ دیکھنے لگے مگر میں کھاٹ پر لیٹا اڑتی ہوئی چڑیوں کے سفید سینوں'بیری کے سبز پتوں اور سامنے دیوار میں چمکتے ہوئے مٹی کے ذروں میں ایک پیکر رعنا دیکھ رہا تھا۔جس کے سر پر جوار تھی جس کی آنکھوں میں نشہ تھا اور زبان پر میٹھی میٹھی باتیں۔

ساری رات نیند نہ آئی اور آتی بھی کیسے جب تصورات اور خیالات کے طوفان نے دماغ کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔میری آنکھوں سے دو چار آنسو بھی گرے اور جب وہ میرے رخساروں پر بہتے ہوئے میرے ہونٹوں کے کناروں پر آ کر رکے اور پھر کانوں کی طرف لڑھک گئے تو میں مسرت اور غم کے امتزاج سے مجبور ہو کر چیخ اٹھا۔میں نے دعا مانگی کہ الٰہی!یہ آنسو میرے رخساروں پر ہمیشہ بہتے رہیں۔میری آنکھیں ہمیشہ اشکبار رہیں۔میرا سینہ سدا جلتا رہے۔مجھے کبھی نیند نہ آئے۔میں مرتے دم تک جاگتا رہوں۔

اگر کوئی شخص میری یہ بات سن لیتا تو یقیناً مجھے دیوانہ کہتا لیکن میں خود اپنے خیالات سے باغی ہو گیا تھا۔میں صبح کو کیا تھا اور شام کو کیا ہو گیا تھا!بیچارے بیل سوتے سوتے چونک پڑے اور میری طرف گردن اٹھا کر دیکھنے لگے۔وہ حیران تھے کہ ہمارے مالک کو آج کیا ہو گیا ہے کہ نہ خود سوتا ہے نہ ہمیں سونے دیتا ہے بکے جا رہا ہے۔ایک بیل تو اٹھ بھی کھڑا ہوا۔کان سیدھے کر کے مجھے گھورنے لگا۔اور زور زور سے سانس لینے لگا۔بے چارہ بے زبان دوست وہ کیا جانے محبت کیا بلا ہوتی ہے۔محبت؟کیا مجھے محبت ہو گئی تھی!اس لڑکی سے محبت ہو گئی تھی!یہ افسانہ بھی حقیقت بن چلا؟اس کا ذکر تو جھوٹی داستانوں کے لیے ہی مخصوص تھا'یہ تو قصوں کا ایک جزو تھی'بھٹکے ہوئے جوانوں کا ایک مشغلہ۔مگر مجھے تو اس میں سچائی نظر آتی تھی۔سچائی'بے چینی اور فرشتوں کی سی پاکیزگی!

میں گجردم اٹھا'ہاتھ منہ دھویا۔درانتی ہاتھ میں لیے بجلی کی سی تیزی سے باہر آیا اور اڑتا ہوا لڑکی کے مکان کے قریب پہنچا۔وہ ایک کونے سے مجھے جھانک رہی تھی۔وہ چہرہ!میں اپنے آپ پر رشک کرنے لگا۔جب میں دالان کے پاس سے گزرا تو لڑکی ایلومینیم کا ایک پیالہ اٹھائے میری طرف آ رہی تھی۔

اس نے پیچھے مڑ کر کہا۔"آ گئے؟"

"اماں یہ ہے وہ لڑکا۔"

''اچھا۔''

ایک بڑھیا دودھ بلو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''روزانہ چھاچھ پی جایا کرو بیٹا' تیرا اپنا گھر ہے۔ غریب تو آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔''

میں نے دل میں کہا۔ ''اور امیر؟ امیر آپس میں دشمن ہوتے ہیں کیا! سچ کہا ہے بڑھیا نے' واقعی دشمن ہوتے ہیں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''بہت اچھا بڑی اماں۔'' پھر لڑکی کے ہاتھ سے پیالہ لے لیا۔ پہلا گھونٹ پیا۔ ہیں! یہ تو میٹھا تھا! کہیں دھوکا تو نہیں ہوا! دوسرا گھونٹ پیا۔ یہ بھی میٹھا تھا! میں نے شکریے کا اظہار کرنا چاہا مگر لڑکی کی سفید پتلی انگلی اس کے نازک ہونٹوں پر پیوست ہوگئی اور آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ میں سارا پیالہ پی گیا۔ اس کے بعد اس نے درانتی ہاتھ میں لی' زری کاندھے پر رکھی اور میرے ساتھ چل پڑی۔

اس طرح پانچ دن گزر گئے!

ہم راستے میں بہت کم باتیں کرتے تھے۔ بس میں جوار اس کے سر پر رکھ دیتا وہ آگے آگے چلنے لگتی تھی۔ تھوڑے وقفے کے بعد وہ پوچھ لیتی تھی۔

''ماں ہے؟''

''کتنے بھائی ہو؟''

''پانی تالاب کا پیتے ہو یا کنوئیں کا؟''

''زمیں کتنی ہے؟

''گا سکتے ہو؟''

آخری سوال نے تو مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ یہ سوال تو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے حیا مانع نہ ہوئی! اور ایک دن تو اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھ لیا۔ ''جوار ختم ہوگئی تو ادھر آیا کرو گے؟''

میں نے کہا۔ ''آیا کروں گا۔''

''آیا کرنا۔''

کچھ قدم چل کر اس نے یہ الفاظ یوں کہے' جیسے میں نہیں سن رہا۔ ''ضرور آیا کرنا۔''

میرا دل دھک سے تڑپا اور اچھل کر رہ گیا۔

پچھلے دن میں نے جوار کاٹ کر پٹڑی کے اس پار دیکھا تو وہی لڑکی ایک خوش پوش نوجوان سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر وہی نوجوان جوار اٹھا کر اس کے سر پر دھرنے لگا۔ اس کے ہاتھوں نے لڑکی کے ہاتھوں کو ضرور چھوا ہوگا۔ یہ کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لڑکی ایسا کیوں کرنے لگی؟ یہ تو ہرجائی معلوم ہوتی ہے! ہر ایک سے محبت! ہر ایک سے پیار! اتنی چنچل! اتنی شوخ کہ ہر راہ گیر سے بے دھڑک دو باتیں کرلے؟ مگر شاید وہ ہر ایک سے اسی طرح پیش آتی ہے جس طرح مجھ سے! شاید میں بھی اس کے لیے ایک معمولی جان پہچان کا ہم پیشہ چھوکرا ہوں! میں غصے سے بے تاب ہو گیا۔ وہ میرے قریب آئی اور بولی۔ ''چلو''

میں نے جوار سر پر رکھی اور چل پڑا۔ کچھ دور جا کر وہ بولی۔ ''آج چپ کیوں ہو؟''

میں نے دل کے شعلوں کو ایک لمبی آہ کے دھوئیں کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ ''بس یوں ہی۔''

کچھ وقفے کے بعد وہ پھر بولی۔ ''اس نوجوان کو دیکھا تھا تم نے؟ اس کا باپ میرے باپ کا بڑا دوست تھا۔ مر گیا ہے بے چارہ اب تو۔''

میرے شکوک اور بڑھ گئے۔ باپ دوست تھا تو بیٹا بھی اس کا دوست ہو' تیرا دوست کیوں ہونے لگا۔ مکان قریب آ گیا۔

اس نے مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رب راکھا۔''

میں نے غم و غصہ کے احساسات پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''رب راکھا۔''

مگر اس کی آنکھوں میں تفکرات کی ایک لہر تھی۔ اس نے جوار دالان میں پھینکی۔ میں نے دیکھا تو وہ منہ کھولے مظلوم ہرنی کی طرح مجھے گھور رہی تھی۔ میں بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔

ہرجائی! تو نے میری اولیں محبت کا ستیاناس کر دیا۔

دوسرے دن میں اس کے مکان سے چکر کاٹ کر پٹڑی پر پہنچا مجھے نہیں معلوم وہ کب آئی اور کب اس نے جوار کاٹی۔ میں تیار ہو رہا تھا کہ اس کی آواز آئی۔ ''ادھر آنا ذرا۔''

مرے دل نے آواز دی۔ ''اسی نوجوان کو آج بھی بلا لے۔''

مگر میں آگے بڑھا۔ جوار اس کے سر پر رکھ دی۔ پھر آ کر اپنا گٹھا اٹھایا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جاتے جاتے وہ اچانک مڑ کر مجھے گھورنے لگی۔ اس کی مدھ بھری آنکھوں کے سرگیں گوشوں پر دو موٹے موٹے قطرے کانپ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر

سرخی سی چھا رہی تھی۔ اس کے ابرو پلکوں کو چھو رہے تھے۔

''تم نے آج چھاچھ نہیں پی۔''

اس کی آواز میں فریاد تھی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''پانی پی لیا تھا گھر سے۔''

آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

''ہرجائی! ہرجائی!''

میرے دماغ میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔

میرے دل نے پکارا۔ یہ آنسو جھوٹے ہیں۔ یہ ظاہرداریاں ہیں ظاہرداریاں۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔ ''کل تو پیو گے نا؟''

''اگر پانی پی کر نہ آیا تو۔''

اس کے بعد وہ مڑی اور اس قدر تیز چلنے لگی کہ اس کے ساتھ میرا چلنا دشوار ہو گیا اور جب وہ گھر پہنچی تو جوار دور پیچ' دوڑ کر مکان کے اندر گھس گئی۔ میرا دل قدرے کانپا' میرا قدم قدرے رکا' میرا ماتھا قدرے ٹھنکا۔ مگر۔ مگر وہ کل والا جوان' اس سے اسے کیا تعلق؟

میں گھر آیا۔ تمام رات وہ لڑکی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میرا تعاقب کرتی رہی اور جب صبح کو میں اٹھا تو ماں میرے سرہانے کھڑی تھی۔

''اٹھو چھاچھ پی لو اور جاؤ۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''کہاں سے آئی ہے چھاچھ؟''

''ایک لڑکی لے آئی ہے ابھی ابھی' شاید تم نے کہا تھا اسے۔''

میں نے چھاچھ پی لی اور جب درانتی کاندھے پر رکھی' رسی ہاتھ میں لٹکائے اس کے مکان کے قریب سے گزرا تو وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے آنکھیں جھکا لیں۔

میں نے پوچھا۔ ''چلو گی؟''

''چھاچھ تو پی لو۔''

میں مسکرایا۔ اس کے اداس چہرے پر مسرت کی گلابیاں دوڑ گئیں۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی۔

''چھاچھ پی تھی یا پانی پیا تھا۔''

''چھاچھ''

''چھاچھ؟''

اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ مجھے اپنے اندر ڈبو لے گی۔

جب ہم جوار اٹھائے واپس آ رہے تھے تو اس نے کہا۔ ''تم خفا ہو گئے تھے؟''

''ہاں' میں سمجھا تم ہرجائی ہو۔''

مجھے اچانک احساس ہوا کہ یہ لفظ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

اس نے غصے سے جوار دور پھینک دی اور سینہ تانے ہوئے میری طرف بڑھی۔

''مجھے پھر تو ایسا نہ کہو گے؟''

''نہیں' پھر نہیں کہوں گا۔''

واقعی میں پھر اسے ایسا نہ کہنا چاہتا تھا۔

ہم کتنی جلدی خفا ہوئے تھے اور کتنی جلدی من گئے تھے۔ چھاچھ کے ایک پیالے سے میرا نصیبا جاگ اٹھا!

اور آج! آج اتنے عرصے کے بعد اسے صرف چھیڑنے کے لیے کہہ دیتا ہوں۔ ''اے میری ہرجائی' ذرا میرا سر تو دبا دے!''

◆◆◆

مسافر

ننھے ننھے جھرنوں کے دائرے میں مخملی گھاس پر سفید بھیڑیں دن بھر پہاڑیوں پر پھرنے کے بعد آنکھیں بند کیے ستا رہی تھیں اور ننھا چرواہا دینو ایک جھاڑی کے پاس پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ سورج مغربی افق کے قریب سنہری بدلیوں کے پتلے پتلے دوپٹوں میں سے وادی کو گھور رہا تھا۔ دور ایک بیری پر چڑیاں ربر کی ننھی منی گیندوں کی طرح اچھل رہی تھیں۔ کوے اپنے گھونسلوں کو اڑے جا رہے تھے۔ فضا میں مست کر دینے والی خنکی سی پھیلی ہوئی تھی۔ دینو آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی جیب سے بھنے ہوئے چنے نکال کر آہستہ آہستہ چبانے لگتا یا لحظہ بھر کے لیے بھیڑوں کو دیکھ لیتا۔ آج رات اس کو وہیں بسر کرنی تھی۔ سرما کا تو معاملہ ہی الگ ہے مگر گرما میں جنگل ہی میں رات کاٹ دینا کوئی اتنی مشکل بات نہیں ہوتی اور یہ دہقان اور چرواہے لوگ تو گرمیوں میں شاید ہی کسی دن باہر نہ رہتے ہوں۔ دن کو گھنی گھنی جھاڑیاں اور بھدے بھدے درخت ان کو دھوپ سے بچاتے ہیں اور رات کو آسمان کی کھلی چھت کے نیچے گھاس پر چادر ڈال کر پڑ رہنا ان کے معصوم اور آزاد دلوں کو تازگی بخشتا ہے۔ سانپ بچھو کا خوف دل میں لائیں تو بے چاروں کی نیندیں ہی اچاٹ ہو جائیں۔ خدا کے سوا ہر چیز انہیں بے ماہی دکھائی دیتی ہے۔ اور جو صرف خدا سے ڈرتا ہے' خدا بھی اس کی نگہبانی کرتا ہے۔

دینو نے آج مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ آسمان پر نظریں جمائے رکھے گا اور معلوم کرے گا کہ اول اول تارے کس طرح نمودار ہوتے ہیں۔ وہ دم سادھ کر پگڑی کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ سیاہی مائل رنگ اختیار کرتے ہوئے آسمان کو نہایت سکون اور جمی ہوئی مشتاق نظروں سے گھورنے لگا۔ ایک ہی نقطے پر نگاہیں گاڑ دینے سے اسے تاروں کے بجائے پہلے تو یہی بھیڑیں ایک دوسری سے چمٹی ہوئی رینگتی معلوم ہوئیں' پھر اپنا کچا مکان نظر آیا جس کے دروازے پر اس کی بوڑھی ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پھر گھر کا بوسیدہ چولہا جس پر مٹی تھوپ تھوپ کر ماں نے اسے چولہے کے بجائے کوئی اور بلا بنا دیا تھا۔ پھر چولہے سے دھواں اٹھتا نظر آیا اور پھر ماں کے ہاتھوں میں آٹا' گھی کا برتن اور پھر چنگیر میں گھی کا ''پراٹھا'' اور مٹی کی رکابی میں گھی میں بھنی ہوئی دال! اس کی زبان تالو سے چمٹ گئی! اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر جیب کی طرف گیا اور اس نے دس بارہ چنے نکال کر منہ میں ڈال لیے۔ اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔

''مگر تارے کدھر بھاگ گئے؟''

اس نے جھنجلا کر اپنی آنکھیں ملیں اور جب دوبارہ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھیں تو لاتعداد شرارے آسمان پر پلکیں جھپک رہے تھے۔ وہ کھسیانا ہو کر مسکرایا۔ اٹھ کر بھیڑوں کے اردگرد چکر کاٹا اور پھر جھاڑی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ لیٹنے ہی کو تھا کہ اسے بھیڑوں کے پرلی طرف ایک درخت کے پاس ایک سایہ ادھر ادھر حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اس نے لاٹھی سنبھالی اور دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا۔ اس کے دماغ میں خیالات بے پناہ سرعت سے آنے لگے۔

''کم بخت میری بھیڑیں چرانے آیا ہے! سمجھا ہوگا دینو لمبی تانے سو رہا ہوگا۔ اب میری لاٹھی کھوپڑی پر پڑی تو سمجھ جائے گا کہ بھیڑوں کے رکھوالوں کی ایک آنکھ سوتی ہے اور ایک جاگتی ہے۔''

وہ لاٹھی کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے آہستہ آہستہ اس کے نزدیک ہوتا گیا۔ یکا یک وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص زور زور سے کہہ رہا تھا۔ ''کوئی انسان بھی یہاں موجود ہے یا صرف بھیڑیں ہیں؟''

دینو نے جواب دینا چاہا مگر وہ پھر بولا۔ ''ارے بھئی میں مسافر ہوں' رستہ بھول گیا ہوں' کوئی آس پاس ہے تو میری مدد کرے۔''

دینو کی تلی ہوئی لاٹھی زمین کی طرف جھک گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ۔ ۔ بے چارہ مسافر! چنوں کے سوا میرے پاس ہے ہی کچھ نہیں اور اس بچارے کو تو بھوک لگی ہوگی۔ کتنی دردناک ہے اس کی آواز! اللہ! تیری دنیا میں راہ سے کوئی نہ بھٹکے! یہ پہاڑی علاقہ' پگڈنڈی سے کسی کا پاؤں پھسل جائے تو سو سو گز گہری کھائیوں میں جا گرتا ہے۔''

مسافر نے نہایت آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ ''شاید کوئی نہیں۔''

دینو نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میں موجود ہوں بھائی' میں موجود ہوں۔ ادھر آ جاؤ' تم رستہ بھول گئے ہو؟ کوئی ضروری کام ہے؟ آج رات یہیں پڑ رہو۔ کل چلے جانا صبح صبح!''

دینو مسافر کا ہاتھ پکڑے جھاڑی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے مسافر کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو محسوس نہ کیا۔ اس کے سلسلہ تنفس کی بے ربطی اور تیزی! اس کی لمبی لمبی آہیں! سوچے سمجھے بولے۔ وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ اندھیرا تھا۔ اور پھر وہ ایک نھا چرواہا تھا جس کے دل کی دھڑکنوں کی اہمیت پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

مسافر نے پوچھا۔ آگ تو نہ جلا سکو گے؟ دیا سلائی ہے؟ میں تو کہیں بھول آیا ہوں۔''

چرواہے نے کمر سے لٹکتی ہوئی ایک پوٹلی کو کھولتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس تو آگ والے پتھر ہیں۔''

پھر دو سرخ سرخ چقماق نکال کر چادر پر رکھ دیئے۔ جھاڑی سے بہت سی خشک ٹہنیاں توڑ لیں۔ پوٹلی سے روئی کا ایک ٹکڑا نکالا

اور منٹوں میں اچھی خاصی آگ تیار کر کے رکھ دی۔

مسافر نے جیب سے پائپ نکالتے ہوئے پوچھا۔ ''چرواہے تم کہاں رہتے ہو؟''

دینو اس ننھے سے حقے کو بغور دیکھ کر بولا۔ ''اس پہاڑی سے ورے میرا گاؤں ہے۔ صاف ستھرے تالاب ہیں۔ تین دکانیں ہیں۔ نمبردار کے پاس کالے کالے توؤں والا باجا ہے۔ نور آباد کا نام تم نے کبھی نہیں سنا؟ اتنا مشہور ہے اور تم نہیں جانتے؟''

''مجھے وہیں جانا ہے۔ گاؤں میں کسی کے گھر نیم کا درخت بھی ہے؟''

''ہاں' وہی تو نمبردار کا گھر ہے! اور آج تو اس کی لڑکی کی شادی ہوگی۔ خوب رونق ہوگی وہاں۔ میں تو اماں سے کہہ آیا تھا کہ حلوا خود ہی نہ اڑا جانا' میرا حصہ رکھ چھوڑنا' کل شام کو آ کر میں گرم کر کے کھاؤں گا۔ تم بھی کل شام ہی چلے چلنا مسافر!''

''مجھے ضرور جانا ہے بھائی۔ اور ابھی جانا ہے' مجھے اپنے گاؤں کا راستہ دکھا دو۔''

''لیکن اتنی اندھیری رات ہے۔ دو چپے کی تو پگڈنڈی ہے۔ پاؤں تلے سے ایک پتھر کھسک جائے تو ڈھونڈے سے ہڈیوں کا نشان بھی نہ ملے۔ تم کیا کرتے ہو! یہیں سو رہو۔ یہ میں اپنی چادر بچھائے دیتا ہوں۔ اور تم تو بھوکے ہو گے' یہ لو چنے۔''

مسافر نے چرواہے کی جیب سے چنوں کی ایک مٹھی بھر لی اور ایک ایک دانہ کر کے منہ میں ڈالنے لگا۔

''میں پہلے بھی اس راہ پر آتا جاتا رہا ہوں۔ تم مجھے رستے پر لگا دو' عمر بھر تمہیں یاد رکھوں گا۔''

''مگر بھائی مسافر تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''نہیں مجھے آج رات ضرور جانا ہے۔ اگر آج نہ جاؤں تو پھر کبھی نہ جا سکوں گا۔ تم یہ باتیں نہیں سمجھتے۔ تمہیں تکلیف تو ہوگی لیکن یہیں سے کچھ پتہ بتا دو۔ میں خود ڈھونڈ نکالوں گا۔''

چرواہا بے کل ہو کر اٹھا اور بولا۔ ''اچھا چلو' لیکن واپس کب آؤ گے؟''

''یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ایک بار تمہیں ملوں گا ضرور! تم اتنے اچھے لڑکے ہو!''

چرواہے کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ دونوں چل پڑے۔ ہر طرف مرعوب کن سکوت تھا۔ کبھی کبھی بھیڑوں کے گلے سے کسی بھیڑ کی آواز آ جاتی تھی اور چرواہا گردن پھیر کر ایک نظر ادھر دیکھ لیتا تھا۔ دونوں خاموش چلتے گئے۔ آخر ایک بہت بڑے درخت کے پاس پہنچ کر چرواہا رک گیا۔

''یہ ہے رستہ آگے جا کر بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ تاروں کی لو میں شاید تمہیں کوئی نشان ملتا جائے۔ تین کوس ہے یہاں سے گاؤں۔

آہستہ آہستہ بھی جاؤ تو آدھی رات کو پہنچ جاؤ گے۔"

مسافر آگے بڑھا۔ چرواہے کے سر پر ہاتھ رکھ کر دو چار لمحے خدا جانے کس سوچ میں ڈوبا رہا۔ اس کے جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے دو قدم پیچھے ہٹ گیا مگر پھر اچانک آگے بڑھا اور چند لمحوں کے بعد اندھیرے میں مل گیا۔ چرواہے کے دل پر بار سا پڑ گیا۔ اس کے قدم بھاری ہو گئے' آنکھیں جلنے لگیں۔ بے چارہ مسافر راستہ بھول نہ جائے! اگر میں اسے گاؤں پہنچا آتا تو کیا تھا! اس نے زور زور سے چیخنا شروع کیا۔ "مسافر! بھائی مسافر! او بھائی مسافر!..."

اس کی آواز خاموش سیاہ پہاڑیوں کی چوٹیوں سے ٹکراتی ہوئی سرمئی فضا میں کھو گئی۔ درختوں سے دو چار چڑیاں پھڑ پھڑا کر اڑیں اور ٹہنیوں سے ٹکرا کر کہیں غائب ہو گئیں۔ دور سے ایک بھیڑ کی آواز سنائی دی۔ چرواہا سر جھکائے اپنی جگہ پر آ گیا۔ وہیں بیٹھ گیا جہاں مسافر بیٹھا رہا تھا۔ آدھی رات تک نیند نہ آئی اور جب سویا تو اس نے دیکھا کہ مسافر اپنا ننھا سا حقہ پی رہا ہے۔ وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ اسے ملنے کے لیے بے چین ہو کر اٹھا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ رات بدستور اندھیری تھی۔ تارے بدستور آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

صبح صبح اسے بہت سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ اٹھا' سامنے چار شخص ہانپتے ہوئے آ رہے تھے۔

"میاں چرواہے' یہاں سے کل کوئی نوجوان تو نہیں گزرا؟"

"گزرا تھا۔"

"کیسا تھا؟ کیا لباس تھا؟ کدھر گیا؟"

"لمبا سا جوان تھا۔ لمبے لمبے بال تھے۔ ایک ننھا حقہ پی رہا تھا۔ کہتا تھا کہ مجھے نور آباد ضرور جانا ہے۔"

اک شخص نے کہا۔ "وہی ہوگا"

پھر آگے بڑھ کر پوچھنے لگا۔ "کس وقت گیا ہے؟"

"رات کو۔"

چاروں نے یک زبان ہو کر تعجب سے کہا۔ "رات کو!"

پھر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

اس شام جب چرواہا واپس گھر آیا اور حلوا گرم کرنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ رات کو علاقے کے بڑے افسر (آنریری مجسٹریٹ)

کا اکلوتا نوجوان بیٹا ایک گہری کھائی میں گر کر مر گیا ہے! جب اس کے مرنے کی خبر گاؤں میں پھیلی تو نمبردار کی بیٹی دلہن کے کپڑے پہنتے پہنتے بے ہوش ہو گئی!

چرواہا ابھی تک مسافر کے لیے پگڈنڈیوں پر نگاہیں جمائے رکھتا ہے! وہ یہ معمانہیں سمجھا!

◆◆◆

غیرت مند بیٹا

جب میری زبان نے ابا کہنا سیکھا تو ابا چل بسے۔ میری ماں کہتی تھی ''جب تمہارے ابا نے آخری بار اپنی دھندلی نحیف آنکھیں کھول کر در و دیوار پر نظریں ڈالی تھیں تو میرا کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ وہ بھوک سے مرا تھا بیٹا۔ تیرا باپ بھوک سے مرا تھا۔ تو اس دن ابا کے پاؤں سے چمٹ کر رو دیا تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد گھر میں ماں کے سوا میں نے کسی کی صورت نہ دیکھی تھی۔ میرا سب کچھ میری ماں تھی۔ مجھے خوب یاد ہے وہ میری انگلی پکڑ کر نمبردار کے گھر لے جاتی' وہاں دن بھر چکی پیستی جاتی' روتی جاتی اور دردناک سروں میں چند الفاظ گنگناتی جاتی۔ میں نے ایک دن پوچھا۔ ''ماں تم گاتی بھی ہو' روتی بھی ہو؟'' وہ مٹھی بھر دانے چکی کے دہانے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''بیٹا صرف روتی رہوں تو گا نہ سکوں گی اور گا نہ سکی تو تم رونے لگو گے' اگر صرف گاتی رہوں تو رو نہ سکوں گی اور رو نہ سکی تو تمہارے ابا کی روح روٹھ جائے گی۔''

ابا!...... میں نے سوچا' کیا میرا بھی کوئی باپ تھا؟ پڑوس میں رحیم میاں رہتے ہیں' ان کو باپ کا کتنا انتظار رہتا ہے اور پھر جب ان کا باپ قصبے سے آتا ہے تو قسم قسم کی مٹھائیوں اور رنگ رنگ کے کھلونوں سے لدا پھندا! میں سمجھتا تھا کہ میری صرف ماں ہی ہے۔ کیا میرا بھی کوئی باپ تھا؟

میں نے پوچھا۔ ''میرا باپ کدھر چلا گیا ہے ماں؟''

''تیرا باپ دور دراز ملکوں میں چلا گیا ہے بیٹا' جہاں نہ وہ ہل چلاتا ہے' نہ زمین کھودتا ہے' نہ اینٹیں ڈھوتا ہے' نہ تپتی دوپہر کو اس کے پاؤں گرم گرم زمیں پر پڑتے ہیں۔ وہ ہم سے روٹھ گیا ہے۔ کبھی ہم بھی اس کے پاس چلے چلیں گے۔''

اس دن سے میرا جی کھیلوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ گلی میں میرے ہم عمر میرا انتظار کرتے کرتے تھک کر چلے جاتے اور میں ماں کے پہلو میں بیٹھا ابا کے متعلق باتیں سنا کرتا۔ ماں کہا کرتی تھیں۔ ''تمہارا باپ غیرت والا مرد تھا۔ اس نے کسی کے پاؤں نہیں چومے' اس نے کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اس نے سر پر ٹوکریاں اٹھائی ہیں' پیٹھ پر دو دو من کی بوریاں لاد کر اونچی اونچی سیڑھیوں پر چڑھا ہے' پتھریلی اور سخت زمینوں میں ہل چلائے ہیں لیکن اس نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے' کسی سے کچھ مانگا نہیں۔ اس نے دکھ

بھوکے لیکن وہ رویا نہیں۔ وہ خالی پیٹ بھی ہوتا تو ہنستے ہنستے سوتا اور اٹھتے ہنستے جاگتا۔ اس نے تنگ آ کر کبھی موت کو دعوت نہ دی۔ وہ تو رونا جانتا ہی نہ تھا۔ وہ کہتا تھا' جو اپنی مصیبتوں سے تنگ آ کر رو دے وہ جینے کے قابل ہی نہیں۔ لیکن بیٹا! جب اس کی سانس حلق میں اٹک رہی تھی اور تم اس کے خشک بکھرے ہوئے بالوں میں اپنی ننھی ننھی انگلیاں ڈالے خاموش کھڑے تھے تو اس وقت ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے رخسار پر ڈھلک آیا اور پھر ایک طرف بہہ کر بوسیدہ تکیے میں جذب ہو گیا۔ یہ اس کا پہلا اور آخری آنسو تھا اور اس آخری آنسو کے ساتھ اس کی آخری سانس بھی رک گئی۔

اتنا بہادر باپ! میں اب کچھ سمجھ دار ہونے لگا تھا۔ غریبوں کے بچے چھوٹی عمر میں ہی بڑی بڑی باتیں سمجھنے لگتے ہیں۔ میں نے سوچا' اگر وہ زندہ ہوتا تو کل رحیم میاں مجھے آنکھیں نہ دکھاتے۔ میری جیب بھی کھانڈ کے لڈوؤں سے بھری ہوتی۔ مجھے بھی چوپال پر زمیندار اپنے پاس بٹھاتے۔

میری ماں کے بالوں پر آٹے کی تہہ ہمیشہ جمی رہی اور ہمارا چولہا اکثر ٹھنڈا ہی رہا۔ اگر کام کے مطابق دام ملا کرتے تو مزدوری کو کون برا کہتا؟ رات کو بھوکا سونا' دن کو خالی پیٹ بیٹھے رہنا مجھے کچھ انوکھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں سمجھتا تھا' ہر کوئی اسی طرح رہتا ہے' سب کی مائیں یوں ہی رات دن کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔

میں بڑا ہوتا گیا تو میرے دل کی دھڑکنیں بھی ذرا تیز اور بے ربط ہوتی گئیں۔ میری انتڑیاں ذرا زیادہ بل کھانے لگیں۔ مجھے زیادہ بھوک محسوس ہونے لگی۔ ماں کے کھردرے ہاتھوں کی بے شمار گانٹھوں میں فاقوں کے لاتعداد افسانے دکھائی دینے لگے۔ میں اپنے آپ کو ایک تباہ حال انسان خیال کرنے لگا۔

مجھے ایک روز ایک زمیندار نے کہا۔ ''ارے تو اتنا بڑا جوان ہو گیا ہے اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟ میرے ہاں اک ہل چلانے والے کی جگہ خالی ہے' محنت سے کام کرے تو ماہوار دو روپے دے دیا کروں گا۔ منظور ہے؟''

میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا۔ ''منظور ہے۔''

وہ مجھے ایک روپیہ بھی کہتا تو مجھے منظور تھا۔

ماں کو میں نے یہ بتایا تو وہ خوش ہو گئی اور مجھے مرحوم ابا کی باتیں سنانے لگی کہ کس طرح اس نے بھی ایک زمیندار کی ملازمت کی تھی لیکن زمیندار اس سے کچھ اچھی طرح پیش نہ آیا اور وہ ہل پھینک کر گھر آ بیٹھا۔

.... اور حیرت کی بات ہے کہ تین ہفتے بعد زمیندار سے میری بھی جھڑپ ہو گئی۔ وہ کہنے لگا۔ ''جا بے جا' گھر میں کھانے کو جو کا

آتا نہیں اور دماغ دیکھو تو جیسے گاؤں بھر کا راجہ یہی ہے۔" میں نے کاندھے پر سے ہل اتار کر اس کی چوکھٹ پر دے مارا اور کہا۔ "گھر میں کھانے کو نہیں تو کیا دل میں غیرت بھی نہیں؟ تیری دو کوڑیوں کے بھروسے پر نہیں جی رہے۔ ہاتھ پیر ہیں تو بھوکوں نہیں مریں گے' تو آنکھیں نہ دکھا۔"

زمیندار تو جہاں کھڑا تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ جو شخص بغیر حیل و حجت کے دو روپے ماہوار پر نوکری کرنے پر رضا مند ہو جائے' وہ مالک سے ناراض ہو کر چل دے تو کیا اسے مرنے کا خوف نہیں ہوتا؟ وہ حیران ہو رہا تھا کہ کیا غریبوں کو بھی غیرت کا احساس ہوتا ہے؟ کیا یہ بھی سوچ سکتے ہیں؟ کیا مفلسی غیرت اور سیرت کا خون نہیں کر دیتی؟

اس کے بعد تین چار بار مجھے اپنا پیٹ غیرت کے بدلے خالی رکھنا پڑا اماں' کتنی بہادر تھی میری ماں! کتنی عجیب عورت تھی وہ عام عورتوں سے کسی قدر مختلف! میری ماں خوش ہو جاتی تھی اور کہتی تھی۔ "شاباش بیٹا! فاقے کر لیں گے لیکن کمینے نہ بنیں گے۔ اپنا گلا کٹتے دیکھ لیں گے لیکن روئیں گے نہیں۔ آنسوؤں کو اگر بہت سستا کر دیا جائے تو ان کی قدر کون جانے۔ یہ موتی دل ہی میں محفوظ رکھنے کے قابل ہیں' مٹی میں ملانے کے لائق نہیں!"

افلاس اور وقت دونوں نے میرے ماں کی صحت پر برا اثر ڈالا۔ ماں کے ماتھے پر لکیریں پڑ گئیں۔ آنکھوں کے کناروں پر جھریوں کے جال بچھ گئے۔ ہتھیلیوں پر چکی کا ہتھا تھامتے گانٹھیں ابھر آئیں۔ آنسو روکتے روکتے آنکھوں کے ڈورے ابھر آئے۔ وہ اتنی بڑی عمر کی تو نہ تھی مگر افلاس بری بلا ہے۔ مفلس کی جوانی گزرنے کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز ہوتی ہے!

میں نے اس کے لیے ٹوکریاں اٹھائیں۔ پتھروں اور اینٹوں کے چھکڑے کھینچے۔ پیٹھ پر بوریاں لادیں لیکن جہاں کسی کا پاؤں مجھے ٹھکرانے کے لیے آگے بڑھا' جہاں کسی کی زبان میرے غرور نفس کو ٹھیس پہنچانے کے لیے حرکت میں آئی' میں نے ٹوکریاں الٹ دیں' چھکڑے پیچھے دھکیل دیئے اور بوریاں پھینک دیں۔ ماں سے زیادہ مجھے اپنے مرحوم ابا کی پاکیزہ سیرت کا پاس تھا۔ میں اپنے باپ کا معزز جانشین بننے کا متمنی تھا۔

آخر ایک روز میری ماں بیمار پڑ گئی۔ غریب بیمار پڑیں تو موت کو اور کام پڑ جاتے ہیں۔ غریبوں پر مصیبتیں ٹوٹیں تو قدرت کی بخششوں کو نیند آ جاتی ہے۔ وہ بیمار پڑی اور تین مہینے کھاٹ پر کروٹیں بدلتی رہی۔ میں نے پٹیاں بھگو بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھیں۔ میں نے اس کے پاؤں رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھوں میں چھالے پیدا کر لیے۔ میں دن بھر مزدوری کر کے رات کو گھر واپس آتا تو اس کی خشک زبان پر اپنے پسینے سے کمائی ہوئے دوا کے چند قطرے ٹپکاتے ہوئے مجھے جو مسرت حاصل ہوتی' اس کا تذکرہ کروں تو آپ

حیران رہ جائیں۔

پھر ہمیشہ کی طرح مزدوری میرے ہاتھ سے جانے لگی۔ ٹھیکے دار بولا۔ ''بوریاں اٹھاتے اٹھاتے پیٹھ کا چمڑا گھس چلا ہے اور گاؤں کے بڑے حکیم جی سے دوا خریدنے بھاگا جا رہا ہے۔ ارے تو کسی راہ چلتے سنیاسی کا دامن پکڑ۔ کوئی گولی دولی لے کر مریضہ سے جان چھڑا اور نہ عمر بھر اس سے چھٹکارا نہ ہوگا۔ جو بوڑھیاں نہ مرتی ہیں نہ جیتی ہیں وہ مائیں بھی ہوں تو انہیں جہنم میں جھونک دینا چاہیے۔''

میری رگوں میں جیسے کسی نے پارہ بھر دیا۔ میرے دل و دماغ کا گودا نشتروں کے ذریعے باہر گھسیٹا جانے لگا لیکن ماں کراہتی ہوئی میرے پردہ تصور پر نمودار ہوئی اور میں نے خاموشی سے بوری اٹھا کر پیٹھ پر دھری اور آگے بڑھ گیا۔

ٹھیکے دار کے روز روز کے طعنے سن سن کر میرا کلیجہ پک گیا۔ میں نے ماں کو یہ حال سنایا تو وہ نحیف جان تڑپ ہی تو اٹھی! کہنے لگی۔ ''اب سارا دن یہیں میرے پاس بیٹھا رہا کر نہیں تو میں خفا ہو جاؤں گی۔ منحوس ٹھیکیدار کی جوتیاں چاٹتا پھرتا ہے۔ قیامت میں اپنے ابا کو کیا منہ دکھائے گا؟''

تین دن میں باہر نہ نکلا۔ چوتھے دن ماں کی حالت خراب ہو گئی۔ گھر میں دوا خریدنے کو پھوٹی کوڑی تک نہ تھی مگر وہ بے ہوش ہو رہی تھی۔ اس کے زرد ماتھے پر پسینے کے قطرے نکل نکل کر اس کے خاکستری بالوں میں الجھ رہے تھے۔ میں اسے یوں بے کسی سے مرتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی حکیم کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑے گا۔ ابا خفا ہوں گے' ماں روٹھ جائے گی۔ لیکن لیکن! نہیں مجھے جانا چاہیے۔

میں دروازے سے نکل کر گلیوں میں سرپٹ بھاگنے لگا۔ میرا دماغ گونج رہا تھا۔ میرا سارا وجود ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھا۔ اچانک مجھے لاتعداد بوتلوں کی قطاریں نظر آئیں۔ پھر ایک مہربان صورت بزرگ! میں نے اپنے آپ کو اس کے قدموں میں گرتے ہوئے محسوس کیا۔ میری زبان بے تحاشا تڑپنے لگی۔

''حکیم جی اللہ تجھے مالا مال کر دے۔ اللہ تجھے ڈھیروں روپیہ دے۔ میری ماں مر رہی ہے۔ اس کے لیے دوا کے چند قطرے۔ میں غریب ہوں۔ میرے پاس ایک کوڑی تک نہیں۔ میں تیرے پاؤں پڑتا ہوں۔ مجھے راہ خدا دو قطرے دے دے کہ میری ماں بچ جائے۔ میں ساری عمر تیرا نوکر رہوں گا۔ ساری عمر تیرے پاؤں دھوؤں گا۔ میری ماں کو بچا لے وہ مرنے کو ہے حکیم جی' حکیم جی!''

بوڑھا بزرگ تیزی سے اٹھا۔ ایک بوتل بغل میں دبائی اور میرے ساتھ بھاگنے لگا' مجھ سے آگے نکل گیا۔ ایک جگہ میں پکار اٹھا۔ ''یہی پرانے چھپر والا مکان ہے حکیم جی۔''

وہ تیر کی طرح مکان کے اندر گھس گیا۔ میں پھر بھی چند لمحوں میں ماں کے پاس تھا۔ دیواریں ناچ رہی تھیں' چھت اوپر ابھری جا رہی تھی' فرش پانی بن کر بہہ رہا تھا۔ میں نے سمجھا میں نے حکیم جی کی جوتیوں کو بوسہ دیا ہے! میری پیشانی جھک گئی۔ میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔ میں آسمانوں کی طرف پرواز کر رہا ہوں!

جب میں نے آنکھ کھولی تو حکیم جی میرے سرہانے آبدیدہ بیٹھے تھے۔

میں نے چیخ کر پوچھا۔ ''میری ماں؟''

باہر کسی درخت پر ایک چیل زور سے چلائی۔ حکیم جی کی ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

میرے کانوں میں ماں کے یہ الفاظ گونجنے لگے۔ ''وہ بھوک سے مرا تھا بیٹا! تیرا باپ بھوک سے مرا تھا!''

میں نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھے۔ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھا اور مرحوم ماں کی سرد پیشانی کو چوم کر دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

میں اس دن بالکل نہ رویا!

◆◆◆

حق بجانب

کیا کبھی کسی عجائب خانے میں کسی حور آسمانی کا موم یا مرمر میں ڈھلا ہوا مجسمہ آپ کی نظروں سے گزرا ہے جس کے سیاہی مائل سنہرے بال اس کے بھرے بھرے گداز شانوں پر بکھرے ہوئے ہوں اور جن کے بارے اس کے تمام جسم کے نمایاں خطوط میں ایک مبہم سا خم پڑ گیا ہو! جس کے لبوں کے گہرے باریک گوشوں میں مسرت وغم کا ایک قیامت آفریں امتزاج کروٹیں لے رہا ہو اور بغور دیکھنے سے یوں معلوم ہو جیسے صناع نے انہیں ابدی ارتعاش کی سزا دے رکھی ہے! جس کی غزال سی آنکھوں کی سیاہی کا آدھا حصہ اوپر کی پلکوں نے ڈھانپ لیا ہو۔ جیسے وہ فرط غم سے بے ہوش ہو رہی ہے اور پلکوں کے ساتھ دو آبدار موتی آنسوؤں کی شکل میں یوں لرز رہے ہوں جیسے دل کسی رگ کے ذریعے اپنی اس کھوئی ہوئی دولت کو پھر اپنے اندر جذب کرنے کی خواہش میں انہیں واپس کھینچ رہا ہے! جس کا سادہ لباس اس پر اطلس وسنجاب کے انباروں سے زیادہ جچ رہا ہو اور جس کے دونوں ہاتھ یوں اٹھے ہوئے ہوں جیسے کوئی شخص دردسر کی شدت سے مجبور ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جانے کو اٹھاتا ہے!

کیا آپ نے کبھی ایسا مجسمہ دیکھا ہے؟

دیکھا تو میں نے بھی نہیں لیکن میں اگر سنگ تراش ہوتا تو اس قسم کا مجسمہ بنانے میں مجھے نہایت آسانی ہوتی کیوں کہ ایک رات میں نے اس تراش خراش کی ایک لڑکی کو اپنے کمرے میں پناہ دی تھی اور اس کے بے پناہ اداس حسن کو میں نے اپنے احساسات میں کچھ اس طرح منتقل کر لیا تھا کہ آج بارہ برس کے بعد بھی میں اس کے جسم کا ایک ایک خط ایک ایک خم با آسانی دیکھ سکتا ہوں۔

شاید آپ اس کا حال سننا پسند فرمائیں۔ سنئے لیکن سن کر بھلا دیجئے کہ چبھتے ہوئے خیال کو اپنے دل میں بہت دیر تک محفوظ رکھنا زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے اور اس تلخی کو شیرینی میں تبدیل ہونے کے لیے کم از کم بارہ برس کا عرصہ درکار ہے۔

''بارہ برس کا عرصہ ہوا میں نے لاہور کو صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ اپنے گاؤں کی معصوم فضا میں رہ کر اپنے دل کو معاشرے کے زنگ سے پاک کر دوں اور ایک کتاب لکھوں جو غیر جانبدارانہ طریقے سے محبت کی تلخیوں اور شیرینیوں پر ایک مبسوط تبصرہ ہو۔ گاؤں میں آ کر میں نے اپنی طبیعت میں کوئی خاص فرق محسوس نہ کیا اور میرا وجدان وہاں بھی تشنہ اطمینان ہی رہا۔ آخر گاؤں سے باہر تین میل کے فاصلے پر میں اپنے کھیتوں میں چلا گیا۔ وہاں آبپاشی کے لیے ایک کنواں تھا جس کے اردگرد سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پاس ہی

ایک کوٹھڑی بھی تھی جو دو آدمیوں کے رہنے کو بہت کافی تھی۔ میں وہیں اپنا سامان اٹھوا لایا۔ صبح شام مجھے ایک ملازم کھانا دے جاتا اور میں اطمینان سے رات دن قلم گھستا رہتا۔ ہاں کئی بار مجھے اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھگونا پڑا کیونکہ آنسوؤں کے بغیر اس منظر کی نقاشی اچھی طرح نہیں کر سکتا تھا جس میں میرے ناول کے کردار آنسو بہا رہے ہوں۔

ایک ایسی ہی رات تھی۔ صبح میرے ایک دوست انور کو ولایت جاتے ہوئے مجھ سے ملنے آنا تھا۔ میں نے سب سامان قرینے سے رکھا اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔ آج مجھے ناول کے ہیرو اور ہیروئن کی آخری جدائی کا نقشہ کھینچنا تھا۔ میں نے میر کا ایک شعر گنگنانا شروع کیا اور ہولے ہولے تلخ یادیں میرے ذہن کی دھندلی سطح پر ابھرنے لگیں۔ دل کو دھکا سا لگا اور آنسو نکل آئے۔ جدائی کی گھڑیاں اپنی روح فرسا طوالت کے ساتھ میرے سامنے لہرانے لگیں۔ میں نے قلم اٹھایا اور لکھنے ہی کو تھا کہ میرے کانوں میں ایک ایسی آواز آئی جیسے کوئی مضبوط پودوں کو جڑ سے اکھیڑ رہا ہو یا توڑ رہا ہو۔ میں قلم رکھ کر باہر بھاگ نکلا۔

میں پوری قوت سے پکارا۔ ''کون ہے؟''

آواز بند ہو گئی۔ کائنات پر مکمل سکوت طاری تھا۔ صرف خاموشی اپنے ختم نہ ہونے والے سروں میں چاروں جانب گنگنا رہی تھی۔ پودوں میں مجھے ایک سایہ سا لرزتا معلوم ہوا۔!

میں نے پھر اسی انداز میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

میں تیزی سے سائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''ایک مسکین عورت ہوں جناب! کچھ کھانے کو مل جائے تو دعائیں دوں گی۔ رستہ بھول گئی ہوں۔ میں نے فصل کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھے معاف کر دیجئے!

آواز میں بڑا درد تھا۔ اس علاقے میں ایسی سلجھی ہوئی گفتگو سن کر میں حیران بھی ہوا پھر پندرہ بیس دنوں سے میں نے کسی عورت کو نہ دیکھا تھا اور عورتوں کی نفسیات کا تجزیہ کرتے وقت مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک ناقابل بیان گھبراہٹ میرے قلم کی روانی میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہے! مجھے کسی عورت کو صرف دیکھ لینے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو حسب بساط نرم کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں آیئے میں حتی الوسع آپ کو آرام پہنچانے کی کوشش کروں گا۔''

وہ میرے نزدیک آ گئی۔ تارے آسمان پر کسی کامیاب ساحر کی آنکھوں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں ان کی لو میں صرف یہ دیکھ سکا کہ وہ عورت سرو کی طرح دراز قد ہے اور بید مجنوں کی طرح نازک اور دبلی ہے۔ میں آگے آگے چل پڑا اور جب ہم کمرے

میں داخل ہوئے تو کافی دیر تک مجھے اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ میرے پاس صبح کے ناشتے کے لیے کافی بسکٹ تھے۔ میں نے ایک پلیٹ میں بسکٹ اس کے آگے رکھ دیئے اور ایک گلاس میں کنوئیں سے تازہ پانی لے آیا۔

وہ بولی۔ ''آپ تکلیف فرما رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی تکلیف نہیں۔''

میری آنکھیں جھکی رہیں۔ میں ڈرتا تھا کہ پہلی بار دیکھتے وقت میری روح میری آنکھوں کی راہ سے باہر نہ آ جائے۔

وہ آہستہ آہستہ بسکٹ چبانے لگی۔ میں نے اپنی ساری قوتیں مجتمع کر کے اس کی طرف دیکھ ہی لیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا!

میری شاعرانہ افتادِ طبع نے کہا۔ ''کوئی حور کہکشاں پر چہل قدمی کرنے نکلی ہو گی اور افق کے پار زمین پر اتر کر رستہ بھول گئی ہو گی!''

اب میری ہمت بندھ گئی۔ میں نے اسے خوب جی بھر کر دیکھا۔ شاید آپ کو تعجب ہو لیکن میرا خیال ہے کہ نسل آدم اس اجنبی عورت پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔ انسان واقعی فرشتوں کے سجدے کا مستحق تھا! مجھے اس دن یہ خیال آیا!

جب وہ بسکٹ کھا چکی اور پانی پی چکی تو اس نے ایک لمبی سانس لی جیسے ساری کائنات کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔ اس کے نتھنے پھڑکے اور دو آنسو اس کے آنکھوں میں ابھر کر ان شفاف کٹوروں پر ایک مہین آبی تہہ بن کر چھا گئے۔

وہ بولی۔ ''آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ اب آپ ذرا دور تک میری رہنمائی کر سکتے ہیں؟ اسٹیشن کو جانا ہے مجھے!''

''کدھر کا ارادہ ہے آپ کا؟''

''کہیں کا بھی ارادہ نہیں!''

''رات کو آپ سوئی بھی نہیں''

''نیند آتی تو کہیں پڑ رہتی!''

''آپ مغموم سی معلوم ہوتی ہیں۔''

''آنسو بس میں نہیں ورنہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دیتی۔''

''شکایت؟''

''ہاں! اس دنیا کو دردمندوں کے آنسوؤں کے متعلق بڑی شکایت ہے۔''

''مجھے تو نہیں' میں تو انہیں ایک نعمت سمجھتا ہوں۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ دیر اپنے ہاتھوں کو یوں ہی ملتی رہی' پھر اٹھی اور کہنے لگی۔ ''اب اجازت دیجیے۔''

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھئے نا' آپ یہاں رات گزار سکتی ہیں' میں باہر درخت تلے پڑا رہوں گا۔ آج کل سردیاں تو ہیں نہیں اور کمبل بھی میرے پاس موجود ہے۔''

وہ کچھ سوچنے لگی۔ بے خبری میں اس کے سر کی میلی چادر کھسک کے نیچے گر گئی' بال بکھر گئے۔ آنکھیں امنڈ آئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ یوں اوپر اٹھائے جیسے کوئی شخص دردِ سر کی شدت سے مجبور ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پیشانی کی طرف لے جانے کو اٹھاتا ہے! وہ غم کی دیوی کا ایک صحیح اور مکمل مجسمہ تھی!

میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

اس جاہل علاقے میں مجھے اس قسم کی عورت سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا' میں نے یہاں بھی کئی مغموم و مخزوں لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن ادھر ان کی شادی کے ڈنکے بجے' ادھر انہوں نے بخوشی اپنے ہاتھوں میں مہندی رچالی اور نوجوان ناکام ہو کر کسی اور سے پینگیں بڑھانے لگے یا کوئی بڑا حوصلے والا ہوا تو کچھ دنوں کے لیے بیمار ہو گیا۔ یہ عورت تو میرے سامنے یونانی صنمیات کا ایک بے مثل مرمریں شاہکار بن کر کھڑی تھی۔

''طنبورے کے تار ٹوٹ جائیں تو اس کی لکڑی کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا؟ گنا چوس لیا جائے تو بیلوں کے آگے پھینک دیا جاتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں نا؟ گاگر سے پانی پی لیا جائے تو پھر کوئی پیاسا اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ آپ دیکھتے ہیں نا؟ آپ مجھے کوئی آوارہ عورت سمجھ رہے ہوں گے یا کوئی بیوہ یا کوئی بھکارن! آپ سے یہ بھی غنیمت ہے ورنہ میں درحقیقت کچھ نہیں۔ میرا وجود صفر کے برابر ہے۔''

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتیں؟''

وہ شاید بیٹھنا بھول گئی تھی۔ اس نے تیزی سے اپنی چادر زمین سے اٹھائی اور سر پر دھر لی۔ پھر بیٹھ کر کہنے لگی۔ ''سانس لینے کو زندگی نہیں کہتے۔ یہ تو بیگار ہے بیگار۔ روح کی قید کی میعاد پوری ہو رہی ہے۔ زندگی تو وہ تھی جب میں انہیں سبزہ زاروں میں' انہیں چراگاہوں میں گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کھیلا کرتی تھی۔ زندگی تو وہ تھی جب میں نے انہیں کھیتوں میں اپنے دل کو دھڑکنا سکھایا تھا۔

زندگی تو وہ تھی جب میرے ہاتھ میں بھی کسی کا ہاتھ تھا۔ اب تو حضرت! بسکٹ کھا کر پانی پی لینا اور آگے چل دینا یہ زندگی ہے! یہ زندگی ہو گی! مجھے کسی سے شکایت نہیں' شکایت کسی حق پر' کسی دعوے پر کی جاتی ہے اور میں کسی چیز کی حقدار نہیں۔ خدا نے مجھے اس دنیا میں بھیج کر بڑی غلطی کی۔ وہیں آگ میں جھونک دیتا تو میں اس کی رحمت کی قائل ہو جاتی۔"

ایک سادہ دہقانی نوجوان عورت کو ایسی گہری گہری باتیں کرتے دیکھ کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے اسے اصل مقصد کی طرف لے جانا چاہا۔

"آپ کسی بڑے زمیندار کی صاحبزادی معلوم ہوتی ہیں؟"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ یہی خیال فرمالیں۔ میرے باپ کے کھیت حد نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن روح کے کرب میں انہوں نے کمی کی بجائے اضافہ کیا ہے۔ میں غریب ہوتی تو با اختیار ہوتی۔ امارات انسان کو بے دست و پا کر دیتی ہے۔ میں پڑھی لکھی بھی ہوں۔ وہیں ہمارے قصبے میں ایک مڈل اسکول ہے۔ جو تھوڑا سا علم حاصل کیا وہ بھی مصیبت ہو گیا۔ علم نہ ہوتا تو احساسات اور امیدوں کی وسعت اس قدر خوفناک نہ ہوتی۔ جہالت بڑی نعمت ہے حضرت! کل ایک جاہل بوڑھا زمیندار ایک جوہڑ میں اپنی بھیڑوں کو نہلا رہا تھا اور گا رہا تھا۔ انسان ایک پنچھی ہے جو اپنے پرانے پر جھاڑ کر پہاڑوں کے ورے چلا جاتا ہے! کیا فنا کا نقشہ اس حسن اس نزاکت سے آپ کھینچ سکتے ہیں؟"

میں نے اپنے چہرے پر سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا۔ "نہیں"

وہ خاموش ہو گئی۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ عورت بڑی دکھیا ہے لیکن اب میرے دل میں اس کی کہانی سننے کی خلش تھی۔

"اپ سوئیں گی یا مجھے کچھ اپنا حال سنائیں گی؟"

"اپنا حال سناؤں گی۔۔۔ مجھے بڑا لطف آ رہا ہے۔ مدت کے بعد میں نے زبان کھولی ہے۔ یہ آپ کے بسکٹوں کا اثر تو نہیں؟"

میں زور سے ہنسا! وہ بھی مسکرائی۔ اتنے درد اور اتنی غمناک فضا میں ایسا انوکھا مذاق! زمیندار لوگوں کو تو پڑھے لکھے جاہل کہتے ہیں!

"میں نے آٹھ جماعتیں پاس کیں۔ ایک دن میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو اسکولوں کے انسپکٹر کا لڑکا تھا۔ باپ کے ہمراہ ادھر سیر کو آنکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور آنکھیں مل کر آگے بڑھ گیا۔

"میں نہیں بتا سکتی کہ مجھے کیا ہوا۔ بس یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے میری روح کو ہتھیلیوں میں دبا کر اس قدر مسلا ہے کہ اب اپنی

اصلی حالت پر آنے کی جدوجہد میں وہ لاکھوں ٹیسوں کا مرکز بن رہی ہے!

"وہ ایک ہفتہ ہمارے قصبے میں رہا۔ میرا بھائی چونکہ ایک اسکول میں استاد تھا اس لیے ہم نے بھی انسپکٹر کا کھانا پکایا۔ وہ نوجوان بھی ہمارے گھر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر اس کے کپڑوں پر جا گرا۔ بے چارے کو بڑی خفت اٹھانی پڑی!

"ہفتے کے بعد وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس کے بعد مجھ پر جو گزری وہ آپ سوچ سکتے ہیں۔ یہ باتیں لمبی ہوتی جا رہی ہیں اور آپ کو تو شاید نیند بھی آ رہی ہے؟"

"نہیں نہیں آپ کہتی جائیں۔"

"مہینے کے بعد وہ اکیلا ہی ہمارے قصبے میں آیا اور ہمارے ہاں ٹھہرا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے۔ میں نے سوچا ایک ہفتہ اور گزار آؤں۔"

"باپ نے تو اس کی خوب خوشامد اور خاطر مدارات کی اور یہی وجہ ہے کہ آج کل میرا بھائی ضلعے کا انسپکٹر ہے۔ خیر ایک دن اس نے مجھے تنہا پا کر کہا۔ "پانی پلا دیجئے ذرا۔"

"میں پانی لے آئی اور اس نے مجھے کچھ عجیب طرح دیکھا۔ اس کے بعد وہ سات دن کی بجائے دس دن رہا اور جب جانے لگا تو اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "پیاری میں صرف تمہارا ہوں۔"

"آپ ہماری محبت کی تدریجی ترقی کا اندازہ خود لگالیں' یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ "میں صرف تمہارا ہوں۔" یہ الفاظ کیسے کیسے عجیب پیراہنوں میں میرے سامنے آئے۔ میں نے امیدوں اور آنے والی مسرتوں کی ایک بہشت آباد کر لی تھی! وہ مجھے اپنی ایک تصویر بھی دے گیا تھا۔"

میں نے وفور شوق میں تیزی سے پوچھا۔ "آپ کے پاس موجود ہے اب؟"

"میں نے دریا میں بہادی تھی۔"

میرا دماغ بھنا گیا!

"اس کا نام یاد ہے اپ کو؟"

"انور!"

میرا خون کھول اٹھا۔

''اور آپ نے اس کا فوٹو دریا میں بہا دیا؟''

''آپ سنیے تو سہی۔ میں نے ایک سال اس کا انتظار کیا۔ آخر اس کا باپ خود آیا۔ وہ خود نہ آیا۔ میرے باپ نے اس سے پوچھا۔ ''انور کیوں نہیں آیا؟''

وہ بولا۔ ''اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا رہا ہے۔ چار پانچ دنوں کے بعد کراچی سے جہاز پر سوار ہوگا۔''

''میرے باپ نے مذاق کے طور پر پوچھا۔ ''کوئی میم ویم نہ لے آئے ولایت سے؟''

''انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''میم ویم کیا لائے گا۔ شادی تو کر لی ہے اس نے!''

''اس کے بعد مجھے کچھ معلوم نہیں۔ آج شام کو میں اٹھی ہوں تو ماں میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ماں مجھے کیا ہو گیا؟''

''بولی تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ مجھے آہستہ آہستہ سب واقعات یاد آنے لگے۔

''میں نے ماں سے کہا۔ ''اب میں اچھی ہوں۔''

''وہ بے چاری خوش ہو گئی۔ باہر فکرمند باپ بیٹھا تھا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میں نے سوچا ذرا باہر گلی میں پھر آؤں' دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں دریا کے کنارے چلی گئی۔ انور کی تصویر نکالی اس کی شبیہ کاغذ پر سے اٹھ کر اوپر اڑنے لگی اور دور افق پر جا کر میرا منہ چڑانے لگی۔ میں نے گھبراہٹ سے پلکیں جھکائیں تو تصویر جیسے مسکرا دی۔ میں نے اسے غصے میں لہروں کے حوالے کر دیا۔ قصبے والوں سے آنکھ بچا کر ادھر چل پڑی کہ ولایت جانے سے پہلے اس سے ایک بات تو کر لوں۔ عورت سے وعدہ کر کے اس کے خلاف ورزی کرنے کی وجہ تو پوچھ لوں۔ میں حق بجانب ہوں نا؟

میں نے کہا۔ ''ضرور۔''

''بس یہ میری کہانی ہے۔''

اس دوران وہ بدستور روتی رہی۔ آنسو اس کے سینے پر گرتے رہے اور اس کی قمیض اس کے جسم سے جگہ جگہ چٹ گئی۔

آخر میں نے کہا۔ ''وہ انور آج صبح یہاں مجھ سے ملنے آئے گا۔ وہ میرا دوست ہے۔''

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ چادر پھر اس کے سر سے کھسک گئی اور وہ پھر یونانی صنمیات کا ایک بے مثل مرمریں شاہکار بن کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔

''یہاں آئے گا؟ کس وقت؟''

''صبح صبح مجھ سے مل کر کراچی چلا جائے گا۔ آپ رات یہاں بسر کریں۔ صبح میں اس سے بات کرلوں گا۔''

اس نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کسی چیز کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''میں خود کرلوں گی' میں خود کرلوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔''

میں نے اس کے لیے بستر بچھایا اور جب میں اپنا کمبل اور کھاٹ اٹھا کر باہر جانے لگا تو وہ بولی۔ ''میں آپ کی بے حد ممنون ہوں' آپ باہر سو رہے ہیں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر مجھے نیند نہیں آتی اور ایک کو نیند نہ آئے تو دوسرا بھی مشکل سے سوتا ہے۔ میں آپ کی بے حد ممنون ہوں۔''

میں مسکرایا اور باہر چلا آیا۔

صبح اٹھ کر میں اندر گیا تو اس کے بستر کو خالی پایا۔ خوب صورت اجنبی عورت کا کوئی نشان نہ تھا۔ میں گھبرا سا گیا۔ میں نے سوچا بے چاری تنگ آ کر گھر چلی گئی ہوگی۔ عورتیں جذبات زدہ ہوتی ہیں۔ لمحہ بھر کے لیے بلبلے کی طرح ابھرتی ہیں اور پھولتی ہیں اور پھر بیٹھ جاتی ہیں۔

سورج ابھر آیا لیکن انور کا کہیں نشان نہ تھا۔ کھانے کے وقت میرا نوکر بھاگا بھاگا آیا اور چلا اٹھا۔ ''حضور آپ کا دوست راستے میں مرا پڑا ہے!''

میرے اوسان خطا ہو گئے۔ جوتا پہنے بغیر وہاں سے بھاگا۔ نوکر نے راستے کے کنارے گھاس پر ایک لاش کی طرف اشارہ کیا جس پر اسی اجنبی عورت کی میلی چادر پڑی تھی!

میں نے جاتے ہی چادر اٹھا کر دیکھا تو ایک خنجر اس کے کلیجے سے پار ہو چکا تھا!

بارہ سال گزر گئے ہیں لیکن اس اجنبی عورت کا کوئی پتہ معلوم نہیں ہوا۔ کہتے ہیں پورب کے پہاڑوں میں کوئی روح اندھیری راتوں میں یہ گیت گایا کرتی ہے۔

''انسان ایک پنچھی ہے جو اپنے پرانے پر جھاڑ کر پہاڑوں کے پرے چلا جاتا ہے۔''

◆◆◆

آرام

بوڑھا علیا اپنے پرانے گھر کی جھکی ہوئی دیوار سے پیٹھ لگائے حقے کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے چلم میں ابھرے ہوئے تمباکو کو انگوٹھے سے دبایا۔ پھر انگوٹھے کو تہ بند سے پونچھا۔ ایک اور بہت لمبا کش لگایا اور اس زور سے کھانسا کہ اس کی زرد دھندلی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی سی دوڑ گئی۔ کھانسنے سے فارغ ہو کر اس نے حقہ پرے رکھ دیا اور گھٹنوں پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دماغ میں خلش سی ہونے لگی اور یکا یک وہ اپنے آپ کو ایک کم سن بچہ سا محسوس کرنے لگا جس کے پاؤں کیچڑ سے بھرے ہوں اور سر کے بال گرد و غبار سے مٹیالے ہو گئے ہوں۔

وہ سوچنے لگا کیا ہی اچھا زمانہ تھا! کتنے ہلکے پھلکے دن تھے اور کتنی ذرا ذرا سی راتیں! آنکھیں بند کیں' کروٹ بدلی اور پو پھٹنے لگی۔ ندی میں ڈبکی لگائی' آنکھ مچولی کھیلے اور سورج مغربی پہاڑوں میں ڈوب گیا۔ تن پر کپڑا نہیں تو نہ سہی' دو دن سے منہ نہیں دھویا تو کیا پروا! کبھی اس گلی میں جا رہے ہیں' کبھی اس چھت پر چڑھ رہے ہیں' کبھی اس مسافر کے پیچھے کتا چھوڑ دیا' کبھی اس فقیر کے چیتھڑے نوچ لیے۔ کبھی ماں سے گڑ کی بھیلی چھین کر ہڑپ کر گئے۔ کبھی ابا کے ہل کی ہتھی پر کیچڑ تھوپ دیا! وہ گھڑیاں کتنی رسیلی گھڑیاں تھیں! پھر اچانک کاندھے پر ہل رکھ دیا گیا۔ آگے آگے بیل چھوڑ دیے گئے۔ دن ذرا لمبے ہو گئے اور راتیں چھوٹی! دوپہر کو تپتی زمین میں ننگے پاؤں ہل چلاتا اور باجرے کی روٹی کے ساتھ پتلی پتلی چھاچھ جس میں نمک تک نہ ہوتا تھا! دو چار دن تو منہ بنایا' تیوری چڑھائی' ہونٹ لٹکائے' ماں سے بولنا چھوڑ دیا' ابا کا حقہ تازہ کرنا بھول گئے لیکن آہستہ آہستہ اس کام میں بھی لذت محسوس ہونے لگی۔ مسکین بیلوں کے پیچھے پیچھے ہل کی ہتھی پر ہاتھ جما کر ایک محدود رقبے میں چکر کاٹنا اور پھر ساتھ ہی ایک گیت گنگناتے جانا' مٹی کو ادھر ادھر پھیلتے ہوئے دیکھتے رہنا! آخر اسی کام میں لطف حاصل ہونے لگا!

اور وہ دن کتنا پیارا دن تھا جب چنوں پہلی بار مجھے ملی۔ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''علیا! تمہاری ماں کسی کام پر جا رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ''بھائی کی طرف جاتے ہوئے علیا کے لیے بھی چھاچھ اور روٹی لیتی جانا۔''

''کہاں رکھوں؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے دے دے۔''

میں ہل چھوڑ کر اس کی طرف آیا اور روٹی لے کر ایک جھاڑی تلے رکھ دی۔ وہ جانے لگی۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ "چنوں تیرا بھائی کہاں ہل چلاتا ہے؟ میں نے تو اسے اس طرف کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ بولی۔ "اس پرلی راہ سے گزر کر اس ڈھیری کے درے ہل چلاتا ہے۔ اب وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

میں نے کھانا کھایا اور بیلوں کو تھپکی دے کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اس دن میں گھر واپس آ رہا تھا کہ چنوں مجھے گلی کے نکڑ پر ملی اور ملتے ہی مسکرا دی۔ میں یہ سمجھا کہ وہ کوئی بات کرے گی لیکن وہ صرف مسکرائی اور آگے نکل گئی۔ ایک دفعہ اپنی چادر سنبھالتے ہوئے اس نے مجھے یوں ہی دیکھا اور میں ایک کمہار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا جو سر پر برتن اٹھائے پردیس جا رہا تھا۔ رات کو مجھے ذرا دیر سے نیند آئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے شانے چھل گئے۔ ماں شاید جاگ رہی تھی۔ پوچھنے لگی۔ "کیا بات ہے علیا! ابھی تک سویا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "نیند نہیں آتی۔ ماں"

وہ بولی۔ "آج دال میں مرچیں کچھ زیادہ تھیں اس لیے مجھے بھی نیند نہیں آتی۔ تمہارا ابا تو مزے سے سو رہا ہے۔"

میں نے تاریک آسمان پر ننھے ننھے تاروں کو گننا شروع کر دیا اور گنتے گنتے سو گیا!

ایک ہفتہ بعد میں صبح صبح اپنے کھیت میں آیا تو دور ہماری بیری پر کوئی بیٹھا مزے سے بیر کھا رہا تھا۔ میں بیل وہیں چھوڑ کر گالیاں دیتا ہوا ادھر بھاگا۔

درخت کے نیچے پہنچا تو دیکھا کہ چنوں ایک ٹہنی سے چمٹی ہوئی کانپ رہی ہے۔ نہ جانے کیوں میں سناٹے میں آ گیا۔ میری زبان گنگ ہو گئی۔ میں چنوں کی طرف دیکھے بغیر مڑا اور اپنے کھیت میں آ گیا۔ میں سارا دن اپنے آپ کو کوستا رہا۔ چار بیروں کے لیے میں نے اس کے سارے خاندان کو برا بھلا کہا تھا۔ اور وہ بے چاری کتنی ڈر گئی تھی! اس کی بھولی بھالی گہری گہری کالی کالی آنکھیں کتنی پیاری ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں بلکہ آنکھوں سے بولنے والی ہے۔ میں کتنا برا شخص ہوں' کتنا کمینہ اور بے حوصلہ!

میں ہل چھوڑ کر بیری کی طرف گیا۔ بیروں کی اچھی خاصی گٹھڑی باندھ کر لے آیا اور گھر واپس جاتے وقت چنوں کے مکان کے قریب سے گزرا۔ وہ صحن میں مرغیوں کو دانہ کھلا رہی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔ اس کی ماں چولھے کے پاس بیٹھی ہنڈیا دھو رہی تھی۔

"لو خالہ! آج یوں ہی خیال آ گیا کہ آپ کو اپنی بیری کے بیر تو کھلائیں' ننھا خانو خوش ہو جائے گا۔"

وہ بہت خوش ہوئی۔ اندر سے چنگیر لے آئی اور سب بیر اس میں ڈال لیے۔ پھر مسکراتی ہوئی بولی۔ ''تم بہت اچھے ہو علیا! تمہاری ماں کہتی تھی کہ علیا بس بھولا بھالا انجان سا لڑکا ہے۔ تم تو اچھے خاصے سیانے جوان ہو۔ جو اپنے پرائے کی تمیز کر لے اسے بھولا کون کہے؟''

واپس جاتے وقت میں نے چنوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ بے چاری حیران ہو رہی تھی اور اس تیزی سے پلکیں جھپکا رہی تھی جیسے آنکھوں میں کوئی تنکا پڑ گیا ہے!

اس رات میں بہت آرام سے سویا۔

دس دن بعد مجھے چنوں پھر کھانا دینے آئی۔ ''تمہاری ماں پانی بھرنے جا رہی تھی۔ بولی آج علیا کی روٹی تم لیتی جاؤ۔'' میں نے کہا ''میں لیتی جاؤں گی''

اس نے جھاڑی کے پاس چھاچھ کا برتن رکھ کر اوپر روٹی دھر دی۔ میں نے پوچھا۔ ''چنوں' تم اس دن بہت خفا ہو گئی تھیں نا' اصل میں مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ پتوں میں چنوں چھپی ہے ورنہ میں خود اوپر چڑھ کر ساری ٹہنیاں جھٹک دیتا!''

وہ مسکرائی۔ اس نے گردن جھکا لی۔ میں نے چاہا کہ بچوں کی طرح ناچوں کودوں۔ میں نے زور سے آنکھیں ملیں اور جب سامنے دیکھا تو وہ ڈھیری کے موڑ پر جا رہی تھی۔

ان دنوں مجھے کوئی بچہ بھی روتا نظر آتا تو میں اس کا گلا گھونٹنے پر تل جاتا۔ میں دنیا کی ہر چیز کو مسکراتا اور قہقہے لگاتا دیکھنا چاہتا تھا۔ ان ہی دنوں میں نے کبڈی کے کھیل میں علاقے کے اچھے اچھے کھلاڑیوں کو یوں سر سے اونچا اٹھا اٹھا کر زمین پر پھینکا کہ بڑے بوڑھوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بے خبری میں گاؤں کے ضعیف العمر دھوبی کی نسوار کی ڈبیا الٹ گئی۔ اس نے کہا۔ بھئی اتنی عمر گزر گئی۔ ان آنکھوں سے تو کیا خواب میں بھی ایسا پہلوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ اللہ اللہ! اچھے اچھے جوانوں کو یوں سر سے گھما کر پھینکتا ہے جیسے سب صابن کے جھاگ کے بنے ہوئے ہیں!

''اس دن میں اپنے دوستوں کے کاندھوں پر سوار گاؤں کی گلیوں میں سے گزر رہا تھا تو مجھ کو دیکھنے کے لیے چنوں اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھت پر چڑھ گئی۔ اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو میرا دل اس زور سے دھڑکا جیسے ہل کی پھال کے ساتھ پتھر ٹکرا جاتا ہے۔

جس دن چنوں سے میری منگنی ہوئی اس دن میرے جسم سے اس قدر پسینہ نکلا کہ میرے کپڑے بھیگ گئے۔ آخر ایک روز میں

گیت گاتا اور زمین کا سینہ چیرتا اڑا پھرتا تھا کہ کسی پتھر سے ہل کی پھال مڑ گئی اور ہتھی ٹوٹ کر پرے جا پڑی۔ میں ہاتھوں کے بل زمین پر آ رہا۔ اٹھ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ ''علیا۔ علیا بھائی!''

چنوں کا بھائی خانو کھڑا رو رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ارے رو کیوں رہا ہے؟ رو کیوں رہا ہے خانو؟''

''چنوں مر گئی!''

میرے سینے سے ایسی آواز آئی جیسے بارود سے کوئی پتھر ٹوٹ جاتا ہے۔ دماغ تپ گیا' نبضیں ڈوبنے لگیں۔ ''چنوں مر گئی!''

پھر میں نے بڑی مشکل سے اسے سے پوچھا۔ ''کیسے؟''

''بھورے بیل نے سینگوں پر اٹھا کر فرش پر دے مارا اور وہ مر گئی!'' وہ بے اختیار رونے لگا۔

میں ہل اور بیل وہیں چھوڑ کر بھاگا۔ چنوں کے گھر کا رخ کیا لیکن پھر مڑ کر اپنے گھر پہنچا۔ دروازے مقفل تھے۔ باہر کھاٹ پر اک کتیا پڑی اونگھ رہی تھی۔ میں دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

چار پانچ سال بعد میں چنوں کو بھول گیا۔ میں کتنا بے حیا اور بے غیرت انسان ہوں۔ میں چنوں کو بھول گیا۔ ایک اور لڑکی سے میری شادی ہو گئی۔ پھر میرے بیٹے ہوئے۔ گھر آباد ہو گیا۔ والدین بھی مر کر بھولے بسرے ہو گئے۔ اک دن چشمے کے پانی میں اپنا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ داڑھی اور کنپٹیوں کے بال سفید سے ہو گئے ہیں۔ قحط پڑا۔ دو بچے مر گئے اور دو بچ گئے۔

وہ اب جوان ہو گئے ہیں۔ چارہ کاٹتے جاتے ہیں۔ رات کو آ کر میرے پاؤں دابتے ہیں' میرا سر سہلاتے ہیں مگر ان کی بہن اداس اداس سی رہتی ہے۔ اس دن نور خان کا لڑکا بیر دینے آیا تو خدا جانے مرغیوں کو دانہ کھلاتے کھلاتے اس کا ہاتھ کیوں رک گیا تھا! کھوئی کھوئی سے رہتی ہے! موسم ہی ایسا ہے! قاعدہ ہے! موسم بدلنے لگے تو طبیعت مغموم سی رہتی ہے۔

اب مجھے کتنا آرام ہے۔ بچپن گزر گیا' ہل چلانے کے دن گزر گئے! چنوں مر گئی۔ بے چاری بھولی بھالی لڑکی! نہ مرتی تو آج وہ بھی میری طرح بوڑھی ہوتی! اس کے بعد شادی بھی ہو گئی۔ بچے بھی جوان ہو گئے' اب آرام ہی آرام ہے' نہ کوئی کام ہے نہ کوئی فکر ہے۔ مزے سے زندگی گزر رہی ہے۔ لطف سے دن کٹ رہے ہیں۔ چنوں یاد نہ آتی تو یہ مزے اور یہ لطف مکمل ہوتے۔ پھر بھی ضرورت کے بغیر دلہیز سے باہر قدم تک نہیں رکھتا۔''

''علیا! او علیا! سو گیا ہے کیا؟''

بوڑھے علیا نے اپنا سر گھٹنوں پر سے اٹھایا۔ اس کی دھندلی دھندلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ الجھی ہوئی داڑھی میں بھی بہت سے قطرے اٹک رہے تھے۔ ''اٹھو تھانیدار صاحب کا بستر اٹھا کر تھانے لے جانا ہے' جلدی اٹھو۔''

''نمبردار جی ہیں؟ بسم اللہ!''

بوڑھا آنسو پونچھے بغیر اٹھا اور نمبردار کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ پھر چوپال کی طرف مڑ گیا!

◆◆◆

وہ جا چکی تھی

اولے پڑے۔ بے چارے مہرو کا ریوڑ باہر تھا۔ غریب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بکریوں نے کہاں پناہ لی ہوگی۔ ایک ایک اولا اخروٹ سے بھی کچھ بڑا ہی تھا۔ اس کی کمزور جھونپڑی کی چھت تک جھک گئی تھی۔ اب اولے بند ہو گئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیاں پڑ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ میں پھاوڑا لے کر چھت پر گیا اور آن کی ان میں منوں بوجھ وہاں سے ہٹا دیا۔

گاؤں کی تمام چھتیں اور گلیاں اولوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ کچھ آدمی چھتوں کو صاف کر رہے تھے۔ مہرو نے آسمان کی طرف دیکھا' بادل کے چھٹنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ اور اس کی غریب بکریاں! کاش وہ اپنی بیمار بہن کو پوچھنے نہ آتا! کاش وہ شام کو بکریوں کو ساتھ لے کر بے فکری سے گھر آ بیٹھتا۔ ماں بہن کی چیخ و پکار سے بے پروا ہو کر اس نے لاٹھی ہاتھ میں لی اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ٹنڈ منڈ درختوں کے جھنڈوں سے اس پار کھیتوں کی وسعتوں میں غائب ہو گیا۔

مہرو دو میل تک اولوں کو روندتا ہوا چلا گیا مگر اس کی بکریوں کا کہیں نشان نہ ملا۔ اگر وہ زندہ نہ تھیں تو کم از کم ان کی لاشیں تو ملتیں۔ دو تین گھنٹے وہ مارا مارا پھرتا رہا' آخر دور سے اسے ایک جھونپڑا نظر آیا جس کے دروازے پر دو بچے کھڑے اولوں کو منہ میں رکھے چوس رہے تھے۔ مہرو کے ہاتھ پاؤں یخ ہو گئے تھے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ ہونٹ نیلے اور چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ وہ ان بچوں کے پاس آ کر رکا اور جھک کر بولا۔

"کہیں کچھ بکریاں دیکھی ہیں تم نے؟"

دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "ہاں"

پھر دونوں "اماں" کہتے ہوئے اندر بھاگ گئے۔

کچھ دیر بعد ادھیڑ عمر کی ایک عورت دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کے آنے سے بھرے ہوئے ہاتھوں کو دونوں بچوں نے تھام رکھا تھا۔ وہ آتے ہی مسکرائی اور کہنے لگی۔ "فکر نہ کرو بیٹا" میں نے تمہارا سارا ریوڑ ایک کوٹھے میں بند کر دیا ہے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا۔ اگر میری بیٹی مجھے خبردار نہ کر دیتی تو تمہارا ریوڑ تباہ ہو جاتا۔ وہ سامنے مکان ہے نا! وہاں چلے آؤ' میری بیٹی وہیں ہوگی۔ ہشیار رہا کرو بیٹا! گرجنے والے بھورے بھورے بادل اولے برساتے ہیں۔ اچھے اچھے بیل بھڑک جاتے ہیں' غریب بکریوں کی کیا بساط!"

''آپ کی مہربانی ہے ماں! میں تو تھک ہار کر مایوس ہو گیا تھا۔''

''آؤ ذرا آگ تاپ لو۔ تم کس قدر کانپ رہے ہو! بھوکے ہو گے تم! ایک دو لقمے کھا لینا۔ آؤ' آؤ نا! اور تو خانو! تو اپنے بھائی کو مٹھی بھر چنے تو دے دے!''

ننھے بچے نے داہنے ہاتھ سے جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو جیب ہی نہیں ملتی ماں!''

''میں آگ تاپتا مگر بہن کی فکر ہے۔ بکریاں لے کر گھر چلا جاؤں گا!''

''تمہاری بہن بیمار ہے؟ خدا رحم کرے۔ میری طرف سے اسے پوچھنا۔''

''بہت اچھا۔''

خانو سے مٹھی بھر چنے لے کر مہرو اس مکان کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر لڑکی اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ یکا یک مہرو کے کانوں میں ایک رسیلی سی آواز آئی۔ لڑکی دھیمی دھیمی لے میں گا رہی تھی۔

آئی گزریساں ڈٹھے سجناں دے دل ماہیا
تیری میری یاری ندیاں چیر کے مل ماہیا

(ماہیا) جو آفت آئے گی برداشت کروں گی۔ میں نے اپنے دوست کو پرکھ لیا۔ تجھ میں اور مجھ میں محبت ہے اس لیے ندیاں نالے پھاند کر مجھ سے مل جاؤ!)

مہرو کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ سریلی دکھ بھری آواز اس کے کانوں کے رستے اس کی روح میں پہنچ کر ایک اتھل پتھل سی برپا کر رہی ہے۔ بے خبری میں اس کے ہاتھوں سے لاٹھی گر گئی۔ لڑکی نے پلٹ کر مہرو کی طرف دیکھا اور لجا کر سر جھکا لیا۔ مہرو اپنی بکریوں کو بھول گیا۔ لڑکی کی مایوس نگاہیں مایوس لے اور مایوس جذبات اس کے تصورات میں ہیجان سا پیا کرنے لگے۔ مہرو نے لاٹھی اٹھائی اور لپک کر دروازے تک پہنچ گیا۔ لڑکی کھڑی ہو گئی اور اپنی کھدر کی چادر کو اپنے گرد لپیٹتی ایک طرف ہو گئی۔ مہرو کی نگاہیں اس کے معصوم سادہ چہرے پر گڑ گئیں۔ بکریاں اپنے آقا کو دیکھ کر باہر دوڑی آئیں۔ دو ایک تو اس کے جسم سے اپنا ماتھا بھی رگڑنے لگیں مگر مہرو لڑکی کے پاکیزہ کشادہ ماتھے کی مقدس تمتماہٹ میں ڈوب گیا تھا۔ یکا یک لڑکی نے اپنا سر اٹھایا۔ وہ حیران تھی کہ نووارد نے ابھی تک اپنا مطلب کیوں ظاہر نہیں کیا۔ اس کے لمبے بالوں کی دو لٹیں اس کے رخساروں کو چھو چھو کر لہرا رہی تھیں۔

اس نے سر جھکائے ہوئے پوچھا۔ ''بکریاں آپ کی ہیں؟''

مہرو چاہتا تھا کہ اپنے جذبات کو الفاظ میں تبدیل کر کے لڑکی کے سامنے رکھ دے مگر وہ ناکام رہا۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ہی ہیں۔''

وہ کانپ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک دوشیزہ اس کے اتنے قریب کھڑی تھی۔

لڑکی نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''تو پھر اپنا مال سنبھال لیجئے۔''

''مہربانی!''

لڑکی نے جوتیوں سے ایک دو ننھے سے اولے نکال کر باہر پھینکے اور چل دی۔ مہرو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور جب وہ اپنی جھونپڑی کے قریب پہنچی تو اس نے مڑ کر مہرو کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکھڑا گیا مگر لاٹھی کا سہارا لے کر سنبھلا اور یہ گیت گاتا ہوا بکریوں کے پیچھے ہولیا۔

''تیری میری یاری ندیاں چیر کے مل ماہیا!'' وہ سر جھکائے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ نیم کی ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں سے لٹکے ہوئے چڑیوں کے گھونسلے اس کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ کئی چڑیاں اور چیلیں گھونسلوں میں پہنچنے سے پہلے ہی اولوں کا شکار ہو کر جھاڑیوں میں اٹکی پڑی تھیں۔ اور کئی ابھی تک ٹوٹتے ہوئے پروں کو بے تابی سے پھڑ پھڑاتی کھیتوں کی مینڈھوں پر رینگتی جاتی تھیں۔ گیہوں کے نوخیز پودے اولوں کے لاانتہا سمندر سے سر نکالے جانے کے جھانک رہے تھے۔ بادل مغرب کی طرف بہے جا رہے تھے۔ افق کے پاس کبھی کبھی بجلی بھی چمک اٹھتی تھی۔ مہرو چلتا گیا' سر جھکائے لاٹھی ٹیکتا ہوا ایک بھٹکے ہوئے بیکس پردیسی کی طرح جو اپنا زادِ راہ قزاقوں کے حوالے کر چکا ہو۔ آخر وہ گھر پہنچا۔

''مہرو!''

اس کی ماں دروازے سے بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے اور آنکھوں کے کناروں پر لاتعداد جھریاں تھیں۔ اس نے دوڑ کر مہرو کا بازو پکڑ کر دبایا۔

''سردی تو نہیں لگ رہی؟ شکر ہے بکریاں مل گئی ہیں بیٹا! سب بچ گئی ہیں نا؟ جیتے رہو۔ دیکھو تمہیں خاتون یاد کر رہی تھی۔''

مہرو نے ایک مظلوم کی طرح ماں کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اس کی ماں کو کیا معلوم تھا کہ اس کا آزاد کھلنڈرا بیٹا آج خدا کی حسین ترین مخلوق سے دوچار ہو کر اپنی روح کو جاودانی شکنجوں میں جکڑ بیٹھا ہے۔ اس کی بیمار بہن نے بمشکل سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا اور مستفسرانہ انداز میں اپنی باریک بھنویں اپنی بیمار اور اداس آنکھوں پر جھکا دیں۔

مہرو نے اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سب بکریاں مل گئی ہیں۔“

”شکر ہے۔“

بیمار بہن کے ہونٹ مسرت سے کانپے' زرد رخساروں کی زردی میں قدرے اضافہ ہوگیا' نازک سوکھے ہوئے ہونٹوں کے معصوم گوشے ایک لمحے کے لیے متحرک ہوئے اور پھر مل گئے۔

اس نے پوچھا۔ ”تم بیمار ہو بھائی؟ تم خاموش کیوں ہو؟“

مہرو کو یکا یک اپنی حالت کا احساس ہوا۔ وہ سنبھل کر اٹھا۔ لاٹھی ایک کونے میں رکھ دی۔ چھاتی کو بے تابی سے ملا اور بہن پر جھک کر کہنے لگا۔ ”نہیں میری اچھی بہن! میں کیوں بیمار ہونے لگا۔ بس سردی کی وجہ سے قدرے چپ ہوگیا تھا۔ کہو اب کیا حال ہے؟ کھانسی تو بہت نہیں آئی؟ اب ٹھیک ہو نا؟“

”کیا بتاؤں بھیا' کھانستی ہوں تو کلیجہ سمٹ سمٹ کر ٹوٹنے لگتا ہے۔ دل رک رک کر کانپتا ہے۔ تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے بھائی' تم میرا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے! تم“

اچانک ماں نے اندر آ کر خاتون کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور غمگین آواز میں بولی۔ ”ایسی باتیں نہ کہا کرو بیٹی' میرا دل دکھتا ہے۔“

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیے۔ خاتون نے کروٹ بدل کر چادر سے آنسو پونچھے' بوڑھی نے آنکھیں مل دیں اور بدنصیب مہرو پانی پینے کے بہانے ایک کونے میں جا کر جی بھر کر رو دیا۔

دوسرے دن مہرو سویرے سویرے اٹھا اور یہ کہہ کر بکریوں کا باڑے سے نکال کر چل دیا۔ ”آج میں شام سے بہت پہلے آ جاؤں گا۔ مجھے بہن کا فکر رہتا ہے۔“

”ماں نے اس کی پگڑی کے کونے میں ایک باسی روٹی اور ایک پیاز باندھ دیا۔ وہ بکریوں کو سیدھا اسی مکان کی طرف لے گیا جو رات بھر اس کے تصورات میں منڈلا کر اس کی نیند حرام کرتا رہا تھا۔ گیلی زمین پر بکریوں کے ننھے سموں کے لاتعداد نشان پڑتے جاتے تھے۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کے اردگرد یا کسی بڑے پتھر کے سائے میں ننھے ننھے اولوں کا ایک انبار سا بھی نظر آ جاتا تھا۔ بے چاری بے زبان بکریاں مڑ کر آقا کو دیکھتی تھیں اور آگے چل دیتی تھیں۔ وہ کیا کھاتیں؟ خاک! گھاس کے اکا دکا جھکے ہوئے تنکوں پر بھی یخ کی ہلکی ہلکی تہہ جمی تھی۔ یکا یک مہرو رک گیا۔ سامنے سے وہی لڑکی آ رہی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہو تم؟“

''بس یہیں تک آئی تھی۔''

''کس لیے؟''

''ماں پوچھتی ہے تمہاری بہن کا کیا حال ہے؟''

''کمزور ہوگئی ہے بے چاری۔ اچھی ہو جائے گی۔''

''ماں کہتی ہے میری طرف سے اسے پوچھنا۔''

''اچھا۔''

لڑکی زمین پر نگاہیں گاڑے کھڑی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے سوال کرتی جائے اور وہ جواب دیتا جائے۔ لڑکی پلٹ کر جانے لگی۔ وہ مڑنے کو تو مڑی مگر اس کے پاؤں میں بھی ہچکچاہٹ سی تھی۔ ایک اضطراب سا! ایک قسم کی پریشانی سی' رکاوٹ سی! اس نے ایک پاؤں اٹھایا اور زمین پر دھرنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک مڑی اور پھر مہرو کے قریب آ گئی۔ اس کے رخساروں پر ایسی سرخی دوڑ گئی جس کا دنیا بھر کے زبان والوں نے ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا۔ آنکھوں پر پانی کی ہلکی سی تہہ چھا گئی۔ ہونٹوں پر حسین بے بسی منڈلانے لگی۔ اس نے دبی زبان میں کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے۔؟''

''مہر خان۔''

''مہر خان؟''

''جی'' ''مہر خان تم...... تم کس وقت گھر واپس جاؤ گے؟''

''شام سے بہت پہلے۔''

''کیوں؟''

''بہن کی دیکھ بھال کے لیے۔''

''تمہارا مکان گاؤں کی کس جانب ہے؟''

''مشرق کی طرف' نیم کے درخت والا مکان۔ ہمارے گاؤں میں اور کسی کے گھر نیم نہیں۔''

''اچھا!''

''مگر یہ تم نے پوچھا کیوں؟''

''گناہ تو نہیں کیا۔''

''نہیں' مگر میرے گھر کا پتہ تو آج تک کسی نے نہیں پوچھا۔''

''غرض والے پوچھ لیتے ہیں مہر خان!''

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف چل دی۔ مہرو دن بھر لڑکی کی باتوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ بکریاں کہیں سے کہیں چلی گئیں۔ آخر شام سے بہت پہلے اس نے سب کو اکٹھا کیا اور وہی پرانا گیت گاتا ہوا گھر کی طرف چل دیا۔

''تیری میری یاری ندیاں چیر کے مل ماہیا''

ابھی مہرو مکان سے کافی دور تھا کہ اسے اپنی ماں تیزی سے اس کی طرف آتی نظر آئی۔

اس نے بہن کی بیماری کی فکر سے مضطرب ہو کر کہا۔ ''کیوں کیا بات ہے ماں؟''

''آج ایک لڑکی تمہاری بہن کو پوچھنے آئی ہے بیٹا! بڑی بھولی اور اچھی لڑکی ہے۔ اس کی ماں تو شاید تمہیں جانتی ہے۔ وہ کہتی ہے مہر خان ہمیں اچھی طرح جانتا ہے!''

مہر خان نے اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ماں' انہوں نے میری بکریوں کو اولوں سے بچایا تھا۔''

مہرو کی ماں نے بکریوں کو باڑے کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ ''اچھا اچھا! خدا ان کا بھلا کرے۔''

مہرو تیزی سے مکان کے دروازے پر آیا اور اندر جھانکنے لگا۔ وہی لڑکی اس کی بہن کے پاؤں سہلا رہی تھی۔

مہرو نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آئیں؟''

لڑکی نے چادر کو ماتھے تک کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ ''اپنی بہن کو پوچھنے۔''

مہرو نے مریضہ کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کیا حال ہے بہن''

''سینے میں آگ لگ رہی ہے میرے بھائی! تمہیں دیکھنے سے جی کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔''

مہرو نے آنکھوں کے کونوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی کھردری پگڑی سے پونچھا اور باہر نکل گیا۔

''لڑکی جس کا نام نور تھا' روزانہ مہرو کے گھر آتی۔ مہرو روزانہ شام سے بہت پہلے گھر پہنچ جاتا اور مہرو کی ماں روزانہ مہرو کو نور کے ساتھ کچھ فاصلے تک بھیجتی تاکہ وہ اندھیرے میں بھٹک نہ جائے۔ دو ایک دفعہ نور کی ماں بھی خاتون کو پوچھنے آئی۔ اب مہرو اور نور کا انس ایک ایسے تعلق میں تبدیل ہو چکا تھا جس کا محبت اور عشق سے بھی کچھ اونچا درجہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے پجاری بن چکے تھے۔

دونوں کی روحیں تحلیل ہوکر ایک ہوگئی تھیں۔انہوں نے ایک دوسری کے جذبات کو آنکھوں کے رستے جذب کرلیا تھا۔

مہرو کی بہن کی بیماری اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھی اور مہرو نور کے ساتھ چند فردوسی لمحے گزارنے کے بعد اپنی بہن کی تباہی کو دیکھ دیکھ کر روتا تھا۔مسرت اور غم کے اس امتزاج سے اس کے حواس بے طرح بے ربط ہو گئے تھے۔اسے اپنی بہن سے بھی محبت تھی۔ اپنی بہن اور پھر اکلوتی بہن سے کس بھائی کو محبت نہیں ہوتی ؟جس بھائی کی کوئی بہن نہ ہو وہ کتنا بدقسمت بھائی ہے!!

ایک دن کا ذکر ہے مہرو اپنی بکریاں گاؤں سے چراگاہ کی طرف لا رہا تھا کہ اسے نور آملی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک جھاڑی کی اوٹ میں لے گئی۔آسمان بالکل صاف تھا۔چڑیاں سبز جھاڑیوں پر پھدک رہی تھیں۔ ہوا ایک مقدس اور پراسرار سرسراہٹ سے ہرے بھرے کھیتوں پر تھرکتی جارہی تھی۔پگڈنڈیاں سنہری فیتے کی طرح میدان کے چاروں طرف بل کھارہی تھی۔نور نے مہرو کے خوب صورت بالوں پر ہاتھ رکھا اور بولی۔"آج تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر مجھے آگ میں جھونک دیا جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں اپنی زندگی کی پروانہ کرتے ہوئے آگ میں کود کر تمہیں باہر نکال لاؤں گا۔یا جل مروں گا۔"

"تم نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔مہر خان! دیکھو مجھے آج ایک مصیبت سے بچاؤ گے؟"

"تم کہو تو سہی!"

"کل صبح میرا باپ مجھے ایک ایسے شخص سے بیاہ دے گا جس سے اسے بہت روپیہ ملنے کی امید ہے۔خدا جانے وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے اور کیسا ہے؟ میں کچھ نہیں جانتی۔اور اگر میں اسے جانتی بھی تو کیا تمہیں چھوڑ کر جاسکتی تھی مہر خان؟"

مہرو کا رنگ فق ہوگیا۔وہ نور کے نزدیک ہوکر بولا۔"مگر تم انکار کردو!"

"میرا انکار میرے باپ کے ارادے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔"

"تو پھر!"

"پھر اس کی ایک ہی صورت ہے۔تم آج شام کو بکریاں گھر پہنچا کر سیدھے ادھر آجانا۔میں اپنے مکان کے پچھواڑے تمہاری منتظر رہوں گی پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔کسی ایسی بستی میں جہاں ہماری محبت پر نکتہ چینی کرنے والا کوئی نہ ہو۔جہاں ہم ان لعنتی بندشوں سے آزاد رہیں۔"

مہرو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"میں ضرور آؤں گا۔"

اور یاد رکھنا' اگر تم شام کے بعد کچھ دیر تک وہاں نہ پہنچے تو پھر۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں' پھر میرا باپ شام کے بعد مجھے ساتھ لے کر اپنے ہونے والے داماد کے گاؤں میں چل دے گا۔ اور میں سچ بتاؤں میں تمہارے بغیر نہ جی سکوں گی۔ صبح کو کسی کنوئیں سے میری لاش ہی ملے گی۔''

''ایسا نہ کہو نورا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں شام تک تمہارے پاس نہ پہنچ سکا تو۔

نور نے مہرو کو روکتے ہوئے کہا۔ ''خیر' مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں تمہیں بہت آزما چکی ہوں۔''

پھر وہ وہاں سے چلی گئی۔ مہرو دیر تک اسے اپنی جھونپڑی کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ سرسبز کھیتوں کے کنارے ایک نوخیز لڑکی کو جاتے دیکھنا کیسا لطیف منظر ہوتا ہے؟

مہرو چاہتا تھا کہ اس کا بس چلے تو وقت کو گردن سے پکڑ کر دور پھینک دے اور دوپہر کو ابھی شام کر ڈالے۔ اس نے کچھ وقت ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گزارا اور شام سے بہت پہلے بکریوں کو ہانکتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بکریاں میرے آگے بھاگتی جائیں اور میں پل بھر میں واپس آ کر نور کے ساتھ کہیں نکل جاؤں۔

گھر پہنچ کر اس نے جلدی جلدی بکریوں کو باڑے میں بند کیا۔ مکان کے اندر جانے کی اسے کوئی ضرورت پیش نہ آئی مگر بہن۔ وہ کانپ کر لوٹا۔ جاتی دفعہ اپنی بیمار بہن کو دیکھنا میرا فرض ہے۔ اس نے آہستہ سے اندر قدم دھرا۔ اس کی ماں فرش پر بیٹھی ماتھے پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ مہرو گھبرا سا گیا۔ ''بہن!''

اس کی بے نور آنکھیں چھت پر گڑی تھیں۔ سانس لیتے وقت گلے میں غرغراہٹ کی سی آواز پیدا ہوتی تھی۔ ابروؤں کے درمیان پسینے کے چند قطرے کانپ رہے تھے۔ مہرو کا سر چکرا گیا' نبضیں بہت تیز چلنے لگیں۔

اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری بہن! میری اچھی بہن!''

خاتون کی آنکھوں میں ایک خفیف سی جنبش ہوئی اور وہ مہرو کے پسینے سے شرابور چہرے پر جم گئیں۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ کچھ کہنے کو ہلے مگر کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ ماں نے اس کے بازو سیدھے کر دیے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک دفعہ کانپی اور سرد ہو گئی۔ مہرو نے اس کی نبضوں پر ہاتھ رکھا اور تیورا کر گر پڑا۔

ہوش آیا تو اس کی بہن کے اردگرد گاؤں کی بہت سی عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں۔ اس کی ماں جھک کر اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''میرے بچے! اب طبیعت کیسی ہے؟''

مہرو گھبرا کر چارپائی سے اٹھ بیٹھا۔ ''کیوں؟ مجھے کیا ہو گیا ہے ماں؟ کیا وقت ہو گیا ہے ماں؟''

''لوگ سو گئے ہوں گے بیٹا!''

''لوگ سو گئے ہوں گے؟ تم نے مجھے جگایا تک نہیں!''

مہرو چارپائی سے کود کر فرش پر آ رہا۔ برہنہ سر برہنہ پا بھاگ کر دروازے تک گیا۔ ایک بار پلٹ کر اپنی مردہ بہن کے حسرت زدہ زرد چہرے کو دیکھا پھر اپنی چیختی ہوئی بوڑھی حیران ماں کو! کچھ رکا' بڑھا' ٹھٹکا اور آنسوؤں کو پینے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے اس نے تیزی سے کواڑ بند کر دیے اور گاؤں سے بھاگ نکلا۔ ماں کی دردناک چیخیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ ہوا کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ دو تین جگہ گھاس میں اس کے پاؤں الجھے اور وہ بری طرح گرا مگر اسے کوئی چیز نہ روک سکی۔ ماں کی وہ آواز بھی نہ روک سکی جس کے سامنے وہ کائنات کو ٹھکرا دینے پر تلا رہتا تھا۔ وہ اندھیرے کو چیرتا' جھاڑیوں کو پھاندتا اور کنکریوں کو روندتا بھاگا جا رہا تھا۔ نور کے مکان کے قریب پہنچا تو اس کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔

اس نے نور کی ماں سے نڈر ہو کر دروازے پر زور زور سے چیخنا شروع کیا۔

''نورا! نورا!! نورا!!!

اسنے اپنی بھوکی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں۔ ستارے مسکرا مسکرا کر اس کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ زور سے ماتھے پر مارے اور دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

وہ جا چکی تھی۔

◆◆◆

انتقام

سیاہ چٹانوں سے گھری ہوئی نیلی جھیل کی سوئی ہوئی سطح پر مرغابیوں کے غول کے غول پھیلے جا رہے تھے۔ مشرقی پہاڑیوں کی چوٹیوں کے قریب سے سورج کی پتلی زرد کرنیں نکل نکل کر فضا میں تیرتی ہوئی چند آوارہ بدلیوں کو سنہری جامے پہنا رہی تھیں اور لہراتی ہوئی بھوری پگڈنڈی پر اکبر اپنی نیلی گھوڑی پر سوار زیر لب گنگناتا ہوا اڑا جا رہا تھا۔ گول گول سنگریزے گھوڑی کے سموں سے ٹکرا ٹکرا کر اور نیچے گھاٹیوں میں لڑھک لڑھک کر ایک عجیب نغمہ الاپ رہے تھے۔

اکبر گاؤں کے ایک بڑے رئیس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دس جماعتیں پاس کروا کے باپ نے اسے اپنی زمینوں کی دیکھ بھال پر مقرر کر دیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ بی اے ایم اے کی آج کل کوئی قیمت نہیں اور اس کا بھتیجا ایم اے ایل ایل۔ بی ہو کر اپنے ضلعے کے صدر مقام میں بیٹھا جو کچھ کما رہا تھا اس سے بھی وہ بے خبر نہیں تھا۔ اکبر نہایت ذکی اور بامذاق نوجوان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں کی مجلس میں بیٹھ کر جب وہ باتیں کرنے لگتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ تجربے کے لحاظ سے وہ ان بھوری ڈاڑھیوں اور جھکی کمروں والے بزرگوں سے کچھ کم نہیں اور جب گاؤں کے ننھے ننھے بچے اسے گلی میں گھیر لیتے اور "پیسے کی ریوڑیاں لے دو، پیسے کی ریوڑیاں لے دو بھیا" کی رٹ لگا دیتے تو وہ انہیں خوش کرنے کے لیے ایسی عجیب عجیب حرکتیں کرتا کہ بھٹیارن کے تنور میں روٹیاں پکوانے والی لڑکیاں ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جاتیں اور خود بھٹیارن کے کھانسی میں لپٹے ہوئے قہقہوں سے تمام محلہ گونج اٹھتا!

آج وہ تحصیلدار صاحب کو ملنے جا رہا تھا جو اس کی تحصیل میں نئے نئے تشریف لائے تھے اور جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ آدھی تنخواہ غریبوں، لنگڑوں، اندھوں اور محتاجوں کو دان کر دیتے ہیں اور باقی نصف سے اپنا بہت بڑے کنبے کا پیٹ پالتے ہیں۔ لوگ پہلے تحصیلدار صاحب سے بے حد تنگ آ چکے تھے کیونکہ تین سال ان کی تحصیل میں رہ کر انہوں نے علاقے کے مرغوں کی نسل تباہ کر دی تھی اور میراسیوں دھوبیوں سے چونی اٹھنی لے کر ان کے سامنے گاؤں کے سردار کو جھڑک دیتے تھے۔

جھیل کے پاس پہنچ کر اکبر نے گھوڑی کی لگام کھینچی اور اس کی گردن پر تھپکی دے کر مرغابیوں کے بے شمار قافلے دیکھنے لگا۔ اچانک ایک طرف سے فائر کی آواز آئی۔ اکبر کی گھوڑی بھڑک کر اچھلی، چٹان پر سے سم پھسل گئے اور گھٹنوں کے بل گر گئی۔ مرغابیاں چیختی، پھڑپھڑاتی سرمئی فضاؤں میں بکھر گئیں۔ دور جھیل کے وسط میں دو زخمی مرغابیاں اپنے پر پھڑپھڑاتی اور اپنے پنجوں سے پانی کی

سطح پر باریک سیدھی لکیریں کھینچتی اوپر اٹھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ادھر سے دو شخص بھی جھیل میں کود پڑے اور بڑی پھرتی سے تیرنے لگے۔ آن کی آن میں انہوں نے مرغابیوں کو جا لیا اور وہیں پانی میں اللہ اکبر پڑھ کر چھری پھیر دی۔ پھر انہیں اٹھا کر تیرتے ہوئے اکبر کی طرف آنے لگے۔

اکبر ایک تو اپنی خوب صورت گھوڑی کے خون آلود گھٹنے دیکھ کر غصے سے لال ہو رہا تھا' دوسرے انہیں قریب سے دیکھ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ دونوں شکاری فتو اور سرخو اس کے خاندان کے جدی دشمن ہیں جن کی اکبر اور اسے کے والد سے آئے دن ذرا ذرا سی باتو ں پر جھڑپ رہتی ہے۔ اکبر غصے سے بل کھانے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں اسے ضرور چھیڑیں گے اور اس سنسان جگہ پر اسے اکیلا دیکھ کر اس کی بے عزتی کرنے کی کوشش کریں گے مگر وہ اکبر کو پہچان کر قدرے ٹھٹکے اور اپنی رفتار میں نمایاں کمی کر لی۔ اکبر کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا اور جب وہ خشکی پر آ کر ایک طرف جانے لگے تو اس نے بھی گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔

وہ ابھی دو فرلانگ دور گیا ہو گا کہ پیچھے سے اسے ایک عجیب قسم کی کھانسی کی آواز آئی اور اس کے بعد اس مخصوص کھانسی کا طوفان جاری ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو شکاری ایک چٹان پر کھڑے اسی مضحکہ خیز کھانسی میں مصروف تھے۔ اور پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہے تھے۔ اکبر کے غرور نفس کو ٹھیس سی لگی۔ شکاری اکبر کو پلٹتا دیکھ کر آگے چل دیئے اور اکبر نے محسوس کیا کہ اگر اس نے ان سے اس بے معنی کھانسی اور بے محل ہنسنے کی وجہ نہ پوچھی تو گاؤں میں جا کر وہ اس معمولی سی بات کو ایسا نون مرچ لگائیں گے کہ ہر شخص یہ یقین کر لے گا۔ کہ اکبر ظاہری طور پر تو مونچھوں کو تاؤ دیئے پھرتا ہے مگر اندر سے کھوکھلا ہی ہے۔ لاڈلی عورت کی طرح بزدل!

اس نے اپنی گھوڑی موڑ کر اس کی باگیں ڈھیلی کر دیں اور آن واحد میں دشمنوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھی پگڈنڈی کے بیچ میں اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اکبر نے جاتے ہی پوری سختی سے پوچھا۔ ''تمہارا اس بے معنی کھانسی اور ان لمبے لمبے قہقہوں سے کیا مطلب تھا؟''

ان میں سے ایک نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا ملک جی کے علاقے میں کھانسنا اور ہنسنا بھی منع ہے؟''

اکبر کا ماتھا ٹھنکا دشمن کی زبان سے ایسے طنزیہ الفاظ سن کر اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ انہیں ڈپٹ کر بولا۔ ''ہاں میرے علاقے میں یہ بیہودہ کھانسی اور یہ فضول قہقہے منع ہیں اور میں ان بدمعاشوں کی گردنیں ناپنے میں بھی طاق ہوں جو اپنے آقا کو آنکھیں دکھانے میں نہیں جھجکتے!

''آج کل ہر شخص اپنا آقا آپ ہے ملک جی! آج کل کوئی کسی کا غلام نہیں۔'' ایک شکاری بولا۔ ''زمانہ بدل چکا ہے اور ایڑیاں

چاٹنے والے کتے' کلیجے نوچنے والے چیتوں میں تبدیل ہو چکے ہیں!''

اکبر بے تحاشا گھوڑی پر سے کود کر نیچے آ رہا اور بید گھماتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟ رتی رتی بھر لوگوں کو من من بھر باتیں زیب نہیں دیتیں۔ ہمارا پس خوردہ کھانے والے ذلیل لوگوں کو اتنے بڑے بول نہیں بولنے چاہئیں۔ سمجھے؟

''بکواس نہ کرو۔'' دوسرا شکاری آگ بگولا ہو کر بولا۔

مغلظ گالیوں اور بلند چیخوں کا طوفان اٹھا اور سورج کی کرنوں میں دہکتی ہوئی چٹانیں حیران سی نظر آنے لگیں۔ اکبر دونوں دشمنوں پر پل پڑا۔ ایک کا چاقو چھین کر ان پر وار پر وار کئے۔ پہلو بدل بدل کر ان پر شیر کی طرح جھپٹتا رہا۔ زخم لیتا رہا اور دیتا رہا مگر اچانک کھوپڑی پر بندوق کا پھل پڑنے سے اس کا دماغی توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ لڑکھڑا کر کنکروں پر گر پڑا۔ گھوڑی اس زور سے ہنہنائی کہ دو دو میل دور کے جھونپڑوں میں سوئے ہوئے کتے بھی بے اختیار چونک کو بھونک اٹھے۔ دونوں شکاری پگڈنڈی چھوڑ کر گہری گھاٹیوں میں بھاگنے لگے اور اکبر کے سر سے خون کی ایک باریک دھار نکل نکل کر اس کی گھوڑی کے سموں پر پڑنے لگی!

بہت دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ سورج افق پر ایک نیزہ بلند ہو چکا تھا اور آس پاس کی پہاڑیوں پر بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ اکبر کے سر میں بے اندازہ درد تھا۔ کاندھے اور چھاتی کے زخم اکڑ گئے تھے۔ گھوڑی کا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل اٹھا۔ منہ پونچھ کر چادر سر پر لپیٹ لی اور گھوڑی پر سوار ہو کر اپنے گاؤں واپس آ گیا۔

اس کا بوڑھا باپ اسے اس ہیئت کذائی میں دیکھ کر لرز اٹھا۔ سفید بھنوئیں' چھوٹی چھوٹی دھندلی آنکھوں پر جھک آئیں۔ ''اکبر بیٹا! کیا ہوا ہے تمہارے دشمنوں کو؟'' اس نے کھاٹ پر سے اترنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

اکبر نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا اور باپ سے اجازت چاہی کہ اپنے تمام مزارعین کو اکٹھا کر کے فتو اور سرخو کے گھروں میں آگ لگا دیں' ان کے بچوں کو ذبح کر دے' ان کی عورتوں کو گلیوں میں ننگا گھسیٹتا پھرے۔ خود ان دونوں کو گیلے تنکوں میں باندھ کر پھینک دے اور تنکوں کو دیا سلائی دکھا دے۔

بوڑھا رئیس مسکرایا اور زخمی بیٹے کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا مانا کہ تم یہ سب کچھ کر سکتے ہو مگر وقت اور تجربے نے مجھے بڑے بڑے سبق سکھائے ہیں۔ معلوم ہے ان باتوں کا انجام کیا ہوگا؟ تم گبرو ہو' تمہارا خون کھول رہا ہے' تم اپنے دشمنوں کی کچی بوٹیاں تک چبانے پر تلے ہوئے ہو' میں نے بھی یہ وقت کاٹا ہے بیٹا! اور اک بار تو میں نے اپنے ایک دشمن کو ایک گلی میں زبردستی گرا دیا اور اس کی ناف پر دہکتا ہوا انگارہ رکھوا دیا۔ لیکن جب تھانے میں طلبی ہوئی' تحصیل میں اپنے شریکوں کے سامنے مجرم

کی حیثیت سے پیش ہوا' جرمانہ ادا کرنا پڑا تو وہ لوگ بھی مجھے آنکھیں دکھانے لگے جن کا کام آٹھ پہر میری خوشامد کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ سوان باتوں میں کچھ نہیں دھرا بیٹا! تم دیکھو گے کہ ایک وقت آئے گا جب تمہارے دشمن تمہارے محتاج ہوں گے اور اس وقت تم ان پر وار کرنے میں حق بجانب ہو گے۔ خاموش ہو رہو۔ تمہارا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے قدرت خود ہی کوئی سبیل پیدا کر دے گی!''

اکبر خاموش ہو رہا مگر بے حد بے دلی سے! اس نے اپنے شانوں کو اس بے قراری سے جنبش دی کہ اس کی چھاتی کے زخموں سے نئے سرے سے خون رسنے لگا۔ ایک دو بار اس کا جی تو چاہا کہ باپ سے چھپ کر وہ چار دوستوں کو ساتھ لے کر دونوں بدمعاشوں کی کھوپڑیاں توڑ کر ان کا گودا نگل جائے اور پھر اس کی ماں نے بھی اس کے اس خیال کی تائید کی اور کہا۔ ''واری جاؤں میرے لال! تجھے ایک بار بچپنے میں کانٹا چبھا تھا اور مجھے رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ اب جو تیری چھاتی اور سر سے سیروں لہو نکل چکا ہے تو میں کیسے کھاؤں پیوں؟ میں کیسے جیوں؟ تیرے ابا کا دل تو برف کا ٹکڑا بن کر رہ گیا ہے۔ انہیں تو نہ اپنی آن کی پروا ہے نہ اپنی شان کی فکر۔ جا کر دس بارہ میراسیوں دھوبیوں کو ذرا سا اشارہ کر دے۔ ان خدائی خواروں کے ہاتھ کاٹ کر لے آئیں کہ میں انہیں پاؤں تلے روند کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کروں!''

لیکن اکبر نے کئی بار اپنے باپ کی نصیحتوں پر چل کر اچھے پھل پائے تھے۔ اب کے گو اسے باپ کی نصیحت میں حکمت نظر نہ آتی تھی لیکن اس کا بغاوت کا جذبہ باپ کی فرمانبرداری کے جذبے سے کچھ نیچے درجے پر ہی تھا اور اس نے اپنا روحانی اضطراب کم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

گلیوں میں اور چوپالوں پر اکبر کے زخمی ہونے کے قصے سنائے جانے لگے۔ اکبر کے گھر لاٹھی ٹیکتی ہوئی بوڑھیوں اور نسوار سونگھتے ہوئے بوڑھوں کا تانتا لگ گیا۔ انہوں نے فتو اور سرخو کو ہزار ہزار گالیاں دیں۔ اکبر کے دوستوں نے باری باری آ کر اپنے آپ کو جان پر کھیل جانے کو پیش کیا لیکن اکبر نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں کسی خاص موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔ انتقام لینے میں اس طرح لطف آئے گا۔ ننھے بچے بھی اس دن اسے پوچھنے آئے۔ گو زبانوں کو جنبش نہ دے سکے مگر ان کی آنکھیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں کہ درد کی شدت میں ہماری ریوڑیوں کو نہ بھول جانا۔ اکبر ان کی تیزی سے جھپکتی ہوئی پلکوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ کر مسکرایا اور انہیں ایک ایک دونی دی۔ دوسرے دن اسے یہ سن کر بہت ہنسی آئی کہ گاؤں کے بچوں نے فتو اور سرخو کی چار بکریوں کی کمریں پتھروں سے توڑ دی ہیں۔

چار پانچ مہینے گزر گئے' بات ٹھنڈی پڑ گئی۔ اکبر دو تین بار تحصیل دار صاحب سے ملاقات بھی کر آیا۔ تھانے دار صاحب سے بھی مل آیا۔ چوپال پر بھی باقاعدہ جاتا رہا۔ بچوں کو بھی بلاناغہ ریوڑیاں کھلاتا رہا لیکن اس کی چال ڈھال' وضع قطع سے اضمحلال سا ٹپکتا تھا' وہ مغموم سا رہتا تھا اور کئی بار بیٹھے بیٹھے اس نے ایک چیز کو دیکھا اور پھر بہت دیر تک اس پر سے نگاہیں نہ ہٹائیں۔ لوگ تو آپس میں چہ میگوئیاں کرتے۔ ''یہ نوجوان اپنے دشمنوں پر بجلی بن کر گرے گا۔ دیکھتے نہیں اس کی حالت؟ یقیناً ان دونوں بدمعاشوں کی موت قریب ہے!''

ایک رات کا ذکر ہے' سردیوں کا موسم تھا اور سردیوں میں چوپال کی محفلیں بہت طویل ہو آتی ہیں۔ کچے کھلے مکان کے وسط میں الاؤ کے اردگرد گاؤں کے بچے بوڑھے اور جوان بیٹھے ہاتھ پیر سینک رہے تھے۔ حقے کا دور چل رہا تھا اور اکبر ان سب کو ووٹ دینے کے طریقوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ ''تم دراصل جانتے نہیں کہ تمہاری ہاں اور نہیں سے کئی بڑے بڑے پیٹ والوں کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ دیکھو اگر تم ووٹ نہ دیتے تو سردار اللہ رکھا اس طرح فوں فاں کرتا ہوا موٹروں میں نہ اڑا پھرتا۔ دیکھی تھی اس کی حالت؟ تمہارے در پر تمہارے بزرگ اور پیر لے کر آیا۔ ووٹ مجھے دینا' ووٹ مجھے دینا۔ میں تمہارے لیے یہ کروں گا وہ کروں گا۔ زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے اس نے اور اب کل ہی کی بات ہے میں نے اسے کہا۔ ''ذرا ہمارے گاؤں کی سڑک تو ٹھیک کرا دیجئے۔ آمدورفت زیادہ ہے' قدم قدم پر گڑھے ہیں۔'' کہنے لگا۔ ''میں نے کوشش تو کی تھی مگر سرکار نے نہ مانا۔'' اب اس سے کوئی پوچھے کہ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اگر اب بھی تم پر سرکار کا بھوت سوار ہے تو ''ہماری حکومت ہماری حکومت'' کی رٹ کیا لگا رکھی ہے۔ صاف کہہ دو کہ ہم تو کھلونے ہیں جن سے سرکار کھیل رہی ہے اور دوسروں کا دل بہل رہا ہے۔''

ایک بوڑھا حقہ اٹھا کر اکبر کے آگے دھرتا ہوا بولا۔ ''لے ملک کش لگا لے اور مجھے یہ بتا کہ تو جو اللہ رکھا کے خلاف اتنی لمبی لمبی باتیں کر رہا ہے تو اپنی حالت کیوں بھول گیا؟ دو کم بختوں نے تجھے ویرانے میں زخمی کر دیا اور تو تب سے اس طرح خاموش ہے جیسے وہ سب کچھ مذاق تھا۔ ہم تیرے غلام ہیں بیٹے! تو مجھ بوڑھے کو اشارہ کرتا تو میں اپنے ان کمزور ہاتھوں سے ان کے حلق دبا دیتا۔ تیرے باپ دادا نے تو ذرا ذرا سی باتوں پر کئی لوگوں کی پسلیاں برچھیوں سے کاٹ کر رکھ دی تھیں اور تو ہے کہ کبھی گاندھی کی باتیں کرتا ہے کبھی سکندر حیات کے قصے۔ تو اپنا علاج کر۔ تجھے معلوم نہیں کہ تیرے اس رویے سے تیرے خاندان کے ماتھے...... پر بوڑھے کو کھانسی شروع ہو گئی اور تمام چوپال والے حیرت سے اکبر کا منہ تکنے لگے جو فرش سے ایک تنکا اٹھا کر خاموشی سے اسے توڑنے میں مصروف تھا۔

اچانک گاؤں میں ایک شور اٹھا۔ تیز و تند چیخ پکار میں "چور۔ ڈاکو بھاگ گئے' ادھر نکل گئے" کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ چوپال والے ہاتھوں میں لاٹھیاں سنبھالتے ہوئے بھاگے۔ ایک ماسٹر جی جو ہفتہ بھر سے پرائمری سکول کے اول مدرس مقرر ہو کر آئے تھے' گلی میں کھڑے چیخ رہے تھے۔ "ارے میں لٹ گیا' میں تباہ ہو گیا' پردیسی کی مدد کرو۔ ڈاکو میرے گھر کا تنکا تنکا اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میری عمر بھر کی کمائی بھسم ہو گئی!" تمام گاؤں جاگ اٹھا۔ نوجوانوں نے گاؤں کے ارد گرد ناکہ بندی کر دی مگر چور کہیں نہ مل سکے۔ پردیسی ماسٹر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ ناکہ بندی کرنے والے نوجوانوں ہی میں چور چھپے ہوئے ہوں۔ مجھ پردیسی کے معاملہ میں گہری تحقیق کرنے والا کوئی نہیں!"

اکبر نے اپنے چوکیدار کو تھانے کی طرف بھیج دیا اور صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی تھانیدار صاحب پانچ سپاہیوں سمیت موقعہ دیکھنے تشریف لے آئے۔ چوروں کے قدموں کے نشان مکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہت دور تک چلے گئے تھے۔ کھوجیوں کو طلب کیا گیا۔ انہیں رخصت کرنے سے پہلے اکبر کے بوڑھے باپ نے انہیں اپنے ہاں بلوایا اور ان کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "تم جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں یاد کیا؟ تم میری غیرت و غصہ سے تو خوب واقف ہو مگر اکبر کے معاملے میں میں خاموش رہا کہ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچے ورنہ ان بدمعاشوں کو میں آن واحد میں چٹکی میں مسل دیتا۔ میں تو ڈرتا تھا کہ اگر میں نے اکبر کو انتقام کی اجازت دے دی اور وہ کوئی اوچھا وار کر بیٹھا تو قانون کب کسی کا ساتھ دیتا ہے؟ اب خدا نے یہ موقع پیدا کیا ہے۔ تو کھوج کے لیے بلائے جا رہے ہو اور یہ تمہارے بس میں ہے کہ تم پاؤں کے نشانات فتو اور سرخو کے گھر لے جاؤ۔ کسی کو شک بھی نہ پڑے گا اور میری روح کو بھی تسکین پہنچ جائے گی!"

بوڑھے کھوجی اپنے بوڑھے آقا کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے اٹھے اور سینکڑوں کے مجمع میں نہایت ہوشیاری سے پاؤں کے نشانات فتو اور سرخو کے گھر تک لے گئے۔ وہ دونوں بھی تماشائیوں میں شامل تھے۔ ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ تھانیدار نے ان کی طرف دیکھا تو انہیں اس قدر پسینہ چھوٹا جیسے ابھی تالاب سے نہا کر نکلے ہیں!

مجمع چوپال پر آ گیا۔ سب لوگ خوش تھے کہ گاؤں کے رئیس کے دشمن ان کے سامنے مجرموں کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔

تھانیدار صاحب نے تمام مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھائیو کھوجیوں کی تفتیش کے مطابق ماسٹر جی کے گھر میں ان بدمعاشوں نے نقب لگائی ہے۔ تم میں وہ کون ہے جو ان کی نیک چلنی کا ثبوت دے سکے؟"

تمام مجمع خاموش تھا۔ تھانیدار صاحب نے اکبر کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اپنی چھڑی سے زمین پر بے ڈھنگی سی لکیریں کھینچ رہا

تھا۔

تھانیدار صاحب بولے۔ ''کیوں ملک اکبر! اب تمام فیصلہ تم پر موقوف ہے۔ تمہاری گواہی ان بدمعاشوں کی قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ تمہارا ان کے چال چلن کے متعلق کیا خیال ہے؟''

فتو اور سرخو سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔ ان کا بچا کھچا خون بھی خشک ہو گیا۔ تمام لوگوں کی نگاہیں اکبر پر جم گئیں۔ اکبر کا باپ بھی ایک طرف ایک پلنگ پر بیٹھا زیر لب مسکرا رہا تھا۔

اکبر نے سر اٹھایا اور دونوں دشمنوں کو دیکھا۔ طرفین کے دماغوں میں ایک بار پھر جھیل کے کنارے سیاہ چٹانوں کے درمیان چھروں اور گھونسوں کے طوفان کا نقشہ پھر گیا۔ اکبر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ رنگ فق تھا۔ سارا مجمع کمال تعجب اور انتظار سے اس کے لبوں کی ذرا سی حرکت کا منتظر تھا!

آخر وہ بولا۔ ''جہاں تک میرا ذاتی تجربہ ہے میں نے ان دونوں کے خلاف کبھی کوئی شکایت نہیں سنی!''

''کیا؟'' بوڑھا بزرگ پلنگ پر اچھل پڑا اور سارا مجمع یوں کانپ گیا جیسے ان کے جسموں میں بجلی کی لہریں حلول کر رہی ہیں۔ فتو اور سرخو آنکھیں جھپکنا بھول گئے!

اکبر پھر بولا۔ ''میں نے انہیں ہمیشہ شریف اور خلیق پایا۔ ان پر چوری کا شک کرنا ظلم ہے!''

سینکڑوں نظریں اکبر پر پڑیں اور تادیر وہیں جمی رہیں۔ تھانے دار صاحب نے فتو اور سرخو کو آزاد کر دیا اور معاملے کی تفتیش نئے سرے سے شروع کر دی!

اسی رات چاندنی کی دھندلی روشنی میں گاؤں سے باہر ایک کھنڈر کے قریب دو سائے منڈلا رہے تھے۔ ایک سایہ بہت باریک آواز میں دوسرے سائے سے بولا۔ ''پیارے اکبر! تم نے اتنی بڑی قربانی دی ہے کہ شاید ہی اس علاقے میں کبھی کسی نے دی ہو۔ تم نے میرے بھائیوں کی جان بچا کر اپنے اس پیار کا ثبوت دیا ہے جس کا کوئی اور چھور نہیں۔ آج کے بعد بھی اگر میں تمہارے پیار کا جواب خاموشی سے دوں تو مجھ جیسی کمینی لڑکی شاید ہی اس دنیا میں کوئی ہو!''

دور جھیل میں چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ گاؤں سے ایک گھوڑی کے ہنہنانے کی آواز آ رہی تھی۔

◆◆◆

غرورِ نفس

عرصہ ہوا ایک پہاڑی گاؤں میں ایک عمر رسیدہ عورت نے مجھے اپنی یہ آپ بیتی سنائی تھی جسے سن کر میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا کہ محبت جاہل انسان کو بھی کس خوبی سے اپنے احساسات کا تجزیہ کرنا سکھا دیتی ہے۔

''غرورِ نفس مجھے اس نووارد نوجوان سے تعلقات پیدا کرنے سے روکتا تھا ورنہ جس دن سے میں نے اسے دکان سے سودا خریدتے دیکھا تھا' میرے کلیجے میں چبھن سی پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر میں گلی میں سے گزرتے ہوئے لوگوں کو چھپ چھپ کر گھورتی رہتی اور جب وہ نوجوان آنکھیں جھکائے ہوئے گلی کے کنارے پر چلتا ہوا دکھائی دیتا تو میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ میں چاہتی تھی کہ دیکھوں مگر پپوٹے من من بھر کے ہو جاتے تھے۔ میرا دل اچھل اچھل کر میری رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑا دیتا تھا۔ میں حیران ہوتی تھی کہ جس شخص کو دیکھنے کے لیے میں اس تپتی دوپہر میں چھت پر لیٹی رہتی ہوں' اسے اپنے سامنے پا کر میں دیکھ کیوں نہیں سکتی؟ میں یہ بھی تو معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے میری طرف دیکھا ہے یا نہیں۔

''میں نے عمر کے سولہ سترہ برسوں میں اپنی بہت سی سہیلیاں صرف اس لیے گنوا دیں کہ ان کے معمولی سے مذاق نے میرے غرورِ نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ ایک دن میری سب سے پیاری سہیلی نے مجھ سے کہا۔ ''جانوں تمہاری ناک ہے یا پودے میں لگی ہوئی سرخ مرچ!'' مجھے جیسے آگ لگ گئی۔ اتنا خیال بھی نہ آیا کہ یہ میری وہی سہیلی ہے جس نے صرف میری خاطر شہر بھر کے طعن برداشت کیے تھے حالانکہ میرے والد اور اسکے والد میں پرانی دشمنی تھی لیکن میں اندھوں کی طرح اس پر برس پڑی اور کہا کہ تم میرے گھر آئی ہی کیوں؟ وہ تو چلی گئی مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں ایک بہت بڑی غلطی کی مرتکب ہوئی ہوں لیکن غرورِ نفس کا احساس میرے پہلے احساس پر غالب آ جاتا تھا اور....... اور اب یہ نووارد نوجوان جسے گاؤں کے دو چار شخص ہی جانتے ہوں گے' جس نے مجھے صرف ایک بار دکان پر سودا خریدتے وقت دیکھا تھا! اس کے پاؤں پڑوں؟....... یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور اسی وجہ سے میں پریشان رہا کرتی تھی!

''والدین کسی گاؤں میں تعزیت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میرا ننھا بھائی اپنے چچا کے ساتھ صبح صبح کھیتوں پر چلا جایا کرتا تھا۔ گھر میں صرف ایک گائے تھی۔ دودھ دوہ کر میرا سب سے پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ چھت پر چڑھ جاؤں۔ ادھر یہ خیال کہ کہیں کوئی مجھے

چھت پر چوروں کی طرح لیٹا دیکھ نہ لے۔ ادھر یہ خلش کہ نووارد نوجوان چپکے سے گزر نہ جائے۔ اندھیری راتوں میں اس کا دراز پیکر میرے مکان کے تنگ دروازے پر لہراتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ نیم کی گنجان ٹہنیوں میں اس کا شرمایا ہوا چہرہ ایک پاکیزہ مسکراہٹ سے کانپتا اور میری جانب بڑھتا۔ پھر اچانک خاموش مغموم فضا میں حلول کر جاتا۔ میں بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ صحن میں چلتی تھی' دوڑتی تھی' آنکھیں بند کر کے ایک جگہ بیٹھ جاتی تھی مگر تصورات کی پرچھائیاں اگر اپنے بس میں ہوں تو انسان کی مصیبتوں کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

میں ایک روز چھت پر چڑھ رہی تھی کہ بہت سے لوگ جن میں نوجوان لڑکیاں بھی تھیں' ایک طرف تیزی سے جاتے ہوئے نظر آئے۔ میں بھی دوڑی' جا کر دیکھا تو وہی نوجوان کمہاروں کے گھر میں ایک چارپائی پر دراز ہے۔ آنکھیں بند ہیں' دانت مضبوطی سے جکڑے ہوئے' چہرے پر زردی اور نیلاہٹ کا دردناک امتزاج' پسینے میں شرابور۔ یا اللہ یہ کیا سحر ہے؟ میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ لڑکیاں تو اپنی انگلیاں ہونٹوں پر رکھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئیں اور مرد اس کے ہاتھ پاؤں زور زور سے ملنے لگے۔ کسی نے اس کے جبڑوں کو علیحدہ کرنا چاہا' کوئی بھاگ کر دکان سے کھانڈ لے آیا مگر اب منہ کھلتا تو کھانڈ اندر جاتی۔ آخر ایک ''سیانا'' بلایا گیا۔ اس نے آ کر اس کے دانتوں کو چھری سے کھولا' پھر کوئی عرق ڈالا۔ ہم لڑکیاں اب بیہوش نوجوان کے قریب آ گئی تھیں۔ اس نے پہلے تو ایک آہ بھری' پھر آنکھیں کھولیں اف کتنی گہری گہری سوچتی آنکھیں تھیں اس کی! ہونٹوں پر زبان پھیری ادھر ادھر دیکھا اور اٹھ بیٹھا۔

حکیم صاب نے پوچھا۔ ''ملک صاحب آپ کو کیا ہو گیا تھا؟''

نوجوان کے چہرے پر خون دوڑ گیا اور اس کے رخساروں پر ایسی رونق آ گئی جیسے اسے تو کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہنے لگا۔ ''حکیم جی! یہ بیماری مجھے یہیں آ کر شروع ہوئی ہے۔ پرسوں بھی اس طرح میں راستہ چلتے چلتے گر گیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ بیماری میرے جان لے کر رہے گی۔ ایسی بیماری پہلے نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ چودھویں صدی میں خدا نے بیماریاں بھی عجیب عجیب پیدا کر دی ہیں!''

سب لوگ مغموم چہرے لیے نوجوان کی صاف اور بھاری آواز سن رہے تھے۔ اس نے بات ختم کر کے مجمع پر نگاہ ڈالی اور جب اس نے ہم لڑکیوں کی طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھے کسی قدر غور سے دیکھا ہے۔ وہ کچھ مسکرایا اور آنکھیں جھکا کر کنکھیوں سے پھر ایک بار دیکھا۔ میں نے دل میں کہا یہ صرف واہمہ ہے۔ وہ اٹھا' لوگ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ ہم لڑکیاں ایک طرف چل دیں ہمارے قریب سے دو شخص باتیں کرتے ہوئے گزرے۔

''بھائی' غریبوں کی آہیں خطا نہیں جاتیں۔ کبھی تم نے سنا ہے کہ ظالم ظلم کر کے خدا کے قہر سے بچ گیا ہو؟''

''یہ جنگلات کے سپاہی غریبوں کی کھال ادھیڑ کر اپنا گھر بھرتے ہیں۔ فصل اٹھاؤ تو پہلے انہیں دو' شادیاں کرو تو پہلے انہیں پوچھو اور جنگل سے کوئی سوکھی ٹہنی لائی ہو تو ان کے پاؤں چاٹو۔ یہ تو بے ہوش ہوا تھا' کم بخت مر جاتا تو اچھا تھا!''

''مرتا تو کوئی اور آ نکلتا۔'' ایک بوڑھا کھنکارتا ہوا بولا اور گلی میں دم لینے کے لیے بیٹھ گیا۔

''میں نے سوچا' آنکھیں زمین پر گاڑ کر چلنے والا شرمیلا نوجوان اور اس قدر ظالم! یہ ضرور ان کی کوئی ذاتی عداوت ہے۔ یقیناً یہ دونوں غلیظ موٹے کرتوں والے دہقان جھوٹ بولتے ہیں جاہل بدطینت لوگ!

''میں گھر آ ئی۔ دوسرے دن والدین بھی واپس آ گئے۔ میرے دل کی جلن روز بروز بڑھتی گئی۔ کھاتی پیتی سوکھی جا رہی تھی۔ ادھر ماں باپ کو فکر پڑ گئی۔ بیس بیس میل دور جا کر تعویذ لے آئے' دوائیں پلائیں مگر میرا رنگ جلا جا رہا تھا۔ ادھر ایک دن میں نے سنا کہ جنگلات کا سپاہی گلی میں چلتے چلتے تڑپنے لگا اور لوگ اسے گھر اٹھا لائے۔ میں یہ سن کر تڑپ اٹھی۔

''جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس شخص سے راہ و رسم پیدا کروں۔ یوں اندر ہی اندر جلتے جلتے جوانی کو ہمیشہ کے لیے روگ لگا لوں گی۔ میری ہمسائیاں جو میری خوب صورتی کی تعریف کرتے تھکتی ہی نہ تھیں' مجھ سے کترانے لگیں۔ کوئی بھول کر بھی تو ادھر نہ آتی تھی۔ گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ مجھے ''بڑی بیماری'' ہے!

''میں ایک روز گلی میں جا رہی تھی کہ ایک بڑھیا ملی۔ میں اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ہمارے گاؤں کی پرانی بھٹیارن تھی جو پچاس برس تنور اور دانے بھوننے کی بھٹی کے سامنے بیٹھ بیٹھ کر کوئلے کی طرح سیاہ ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کہاں جاتی ہو بڑی اماں؟''

''کہاں جانا ہے بیٹی' بوڑھوں کا ٹھکانا ہی کہاں ہے' جہاں چھاؤں دیکھی بیٹھ گئے۔ سنا ہے تم بیمار ہو' واری جاؤں آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔ یہ جوانی اور پھر یہ رنگ! اللہ رکھے تم اتنے بڑے زمیندار کی بیٹی ہو' کوئی ٹونا ٹوٹکا لاؤ' یوں تو یہ اندر کی بیماری بڑی خطرناک ہے۔''

''بڑھیا کی یہ بات سن کے میں گھبرائی کہ اس ڈائن کو اندر کی بیماری کا راز کیسے معلوم ہو گیا؟

میں نے ذرا تنک کو پوچھا۔ ''اندر کی بیماری سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

بولی۔ ''یہی فکر' وہم' کوئی ایسی الجھن جو دوسروں کو بتانے سے شرم آئے۔ تو یوں تو گزر نہ ہو گی بیٹی' ادھر آؤ نا۔'' یہ کہہ کر اس نے

میرا بازو پکڑ لیا۔

''میں نے پوچھا۔''کدھر؟''

کہنے لگی۔''ادھر کسی سائے میں۔میں تم کو دو چار باتیں سمجھانا چاہتی ہوں۔''

''میں اس کے ساتھ اس خیال سے چل پڑی کہ شاید میری بیماری کے علاج معالجہ کے متعلق کوئی مشورہ دے۔بوڑھوں کی یہی عادت ہوتی ہے کہ بن بلائے مہمان بن جاتے ہیں۔

''وہ مجھے ایک غیر آبادی جگہ لے لی۔ادھر ادھر دیکھا اور چوروں کے سے لہجے میں بولی۔''بیٹی تو کس خیال میں گھلی جا رہی ہے؟''

''میں نے غصے میں کہا۔''کیسا خیال؟تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس قسم کی واہیات باتیں کرتی ہو!''

''اس نے یکا یک میرے پاؤں پر اپنا ڈھیلا ڈھالا ٹھنڈا ہاتھ رکھ کر کہا۔''بیٹی اس میں تیرا ہی بھلا ہے۔نوجوان ہے'ابھی تیری شادی نہیں ہوئی۔میں نے بھی یہ دن گزارے ہیں۔ابلتے ہوئے خون کی امنگیں میں جانتی ہوں جانوں رانی!میں نے اپنی جوانی کس طرح گزاری؟وہ بیٹی تجھے کیا معلوم؟جاننے والے مر گئے۔قیامت برستی تھی میری چال ڈھال سے۔گاؤں کے جوان میرے قدموں تلے اپنے سر رکھ دیتے تھے۔میرے تلووں سے اپنے ماتھے ملتے تھے اور تو تو ماشاءاللہ اتنی من موہنی ہے' تو کاہے کو یوں موت کے منہ جانے لگی؟کسی کا نام تو لے۔میں کان پکڑ کر اسے تیرے آگے لا ڈالوں!''

''میں غصے میں بے کل ہو گئی۔اس بوڑھی چڑیل کی باتیں زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح میرے دل میں گڑی جا رہی تھیں۔

میں نے کہا۔''بس بہت باتیں نہ بنا'میں ابھی گھر جا کر ابا کو سب کچھ بتا دوں گی اور تو میرے گھر والوں کو جانتی ہے تیری لٹکتی ہوئی کھال کھینچ لیں گے۔میں تیری بدزبان بدچلن پوتیوں کی طرح نہیں ہوں کہ مردوں سے آنکھیں لڑاتی پھروں۔مجھے جانے دے ورنہ تیری خیر نہیں۔''

''مگر بیٹی!''اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔''تم نہیں جانتیں کہ یہاں پڑوس میں ایک خوب صورت نوجوان تمہارے لیے کس قدر بے کل ہے؟''

جواب میں میں نے تیزی سے گھر کی جانب چلتے ہوئے کہا۔''چپ رہ'بکواس نہ کر۔''

بڑھیا نے کھانستے ہوئے صرف اتنا کہا۔''وہ جنگلات کا سپاہی بے چارہ۔''

جنگلات کا سپاہی!میرے قدم رک گئے۔مگر غرور نفس!میں آگے بڑھ گئی۔پھر بھی جی چاہتا تھا کہ واپس جا کر اس بڑھیا کو سائے

میں بٹھاؤں' اس سے سپاہی کی باتیں کروں' اسے اپنا دوپٹہ اتار کر دے دوں۔ اس کے جھریوں والے آبنوسی ماتھے کو چوم لوں۔ میں کتنی خوش تھی! جب میں گھر آئی تو ابا مجھے دیکھتے ہی پکار اٹھے۔ ''دیکھا' پیر جی کی کرامت کا اثر دیکھا۔ میری جانوں کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگا ہے اس تعویذ سے!''

''میں نے دل میں کہا۔ بھولے ابا تمھیں کیا معلوم کہ میری قسمت کا پانسہ پلٹ گیا ہے۔ اب میں تعویذ گنڈے کے بغیر اچھی ہو جاؤں گی! اس دن گھر کے جتنے کام میں نے کیے اور جس سلیقے سے کیے وہ تجربہ کار سے تجربہ کار عورتیں بھی اس سلیقے کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں۔ گھر والے بھی حیران تھے۔

لیکن سپاہی میاں کی بھیجی ہوئی عورت کے رعب میں آ کر اس کے ہاں جانا مجھے منظور نہ تھا۔ یہ تو اک قسم کی بھیک تھی' محتاجی' محتاجی تو ایک لعنت ہے۔ وہ خود یہاں آئے' میری ناز برداری کرے' میرے قدم چومے تو میں اس سے بات کروں' مگر یہ تو بری بات ہے۔ آخر میں نے کئی دہکتی ہوئی دوپہریں مکان کی چھت پر بیٹھ کر صرف سپاہی میاں کے لیے گزار دی تھیں۔ پانچ چھ ماہ سے اپنے سینے میں ایک ایسی تپش کو پرورش دے رہی تھی جس سے میری رگ رگ میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ محبت کے آگے غرور نفس کیا شے ہے! بڑے بڑے چودھریوں نے غریب غریب لڑکیوں کی ایڑیاں چاٹی ہیں اور بڑی بڑی شہزادیوں نے مفلس دہقانوں کی ناز برداریاں کی ہیں۔ مجھے اس کے ہاں چلا جانا چاہیے مگر میں اٹھتے ہی بیٹھ جاتی تھی' چلتے ہی رک جاتی تھی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ نہیں جانا چاہیے۔

''اب مجھے یقین تو ہو گیا تھا کہ جس کے لیے میں اتنے عرصے سے بے تاب تھی' وہ خود میرے ساتھ محبت کرتا تھا۔ میں اکثر راتوں کو سوچا کرتی تھیں کہ اب اس کا کیا حال ہوگا؟ بے چارہ اکیلا بیٹھا ہوگا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوں گے۔ سینے میں جلن ہوگی۔ جانوں جانوں زبان پر ہوگا۔ دردناک کلیاں' دکھ بھرے دوہے' دھیمی لے میں الاپ رہا ہوگا۔ بے چین ہوگا' بہت بے چین!

ایک رات میں اپنی چارپائی سے اٹھی اور ماں کی چارپائی کے پاس سے آہستہ آہستہ گزرتی ہوئی باہر گلی میں آ گئی۔ ایک نوجوان کنواری لڑکی اور آدھی رات کے وقت سنسان گلی میں! کوئی دیکھ لے تو کیا کہے! گاؤں بھر میں نوردین کی لڑکی کا ڈھنڈورا پٹ جائے۔ سہیلیاں مجھ سے نفرت کریں' ماں دھتکار دے' باپ ٹھکرا دے۔ مگر آج محبت تمام مجبوریوں پر غالب آ رہی تھی۔ میں دیواروں کے ساتھ لگ لگ کر چلتی ہوئی سپاہی کے مکان کے کھلے دروازے پر پہنچ گئی۔

اندر وہی منظر نظر آیا جو میں اکثر اپنے تصور کی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی ایک ہچکی کی سی آواز

آ جاتی تھی۔ اچانک وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب اگر بھاگتی ہوں تو یہ دیکھ لے گا' وہیں کھڑی رہتی ہوں تو بھی اس کی نظر ضرور پڑے گی۔ صاف ظاہر ہو جانے سے میں نے دیوار کے ساتھ چمٹ جانے کو ترجیح دی۔ وہ باہر نکلا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا چپکے رو تا رہا۔ اسے کیا معلوم کہ جس کے لیے وہ آنسو بہا رہا تھا' وہ اس کے پہلو میں کھڑی ہے۔ صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ میں نے بھی زندگی میں پہلی بار اسے اپنے اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا' میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے۔ میری آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ میں گویا دوزخ میں کھڑی ہو کر بہشت دیکھ رہی ہوں' میں گویا کانٹوں پر بیٹھی پھول سونگھ رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اپنے محبوب کو مس کروں' اس کے گرم گرم جسم کو اپنی سرد سرد باہوں سے چھوؤں' اسے تسلی دوں' اسے سمجھاؤں مگر مگر مجھے کسی چیز نے اندر ہی اندر روکا۔ میرے دل میں کسی نے چٹکی لی۔ میرے کلیجے کو کسی نے اپنے پنجے میں بھینچا۔ میں دیوار میں پیوست ہو گئی۔

وہ جانوں جانوں کرتا ہوا وہیں دہلیز پر بیٹھ گیا اور پھر اچانک کانپ کر پیچھے گر گیا۔ میں بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔ اسے چھوا' اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ آہستہ سے بلایا مگر وہ بے ہوش تھا۔ میں گھبرا گئی۔ مجھے اس کے بے حس و حرکت پیکر سے خوف معلوم ہونے لگا اور پھر میں بے تحاشا اپنے گھر کی طرف بھاگ اٹھی۔ سامنے کوئی شخص آتا ہوا نظر آیا۔ میں دیوار کے ساتھ زمین پر چت لیٹ گئی گاؤں کا پہرہ دار اپنی لمبی لاٹھی کاندھے پر دھرے کوئی گیت گنگناتا ہوا گزر گیا۔ میں اٹھ کر پھر بھاگی مگر میرا دل سخت مضطرب تھا۔ سپاہی بے چارہ اپنی دہلیز پر بے ہوش پڑا تھا اور میں! کس قدر سفاک۔ کتنی بے غیرت اور بے شعور لڑکی تھی۔ میں نے سوچا اگر وہ ہوش میں آ جاتا اور مجھے دیکھتا تو شاید یہ خیال کرتا کہ اس کا پیار مجھے کھینچ لایا ہے۔ نہیں میں نے اچھا کیا چلی آئی۔ بہت اچھا کیا!

"مجھے اپنی محبت اور اپنے اس انوکھے غرور کا احساس تو ضرور تھا ورنہ آپ جانیں کسی کے آگے اپنے خیالات یوں کسی جاہل عورت نے بیان کئے ہیں؟ میں سوچا کرتی تھیں کہ آخر یہ دو جذبوں کے پاٹوں میں کیوں پسی جا رہی ہوں؟ وہ کون سی ضروری گتھی ہے جسے سلجھانے کے لیے خدا نے میری روح میں محبت اور نفرت کا ایک نرالا مرکب پیدا کر دیا ہے؟ سپاہی' میرا سپاہی' میرا راجہ مجھے کتنا پیارا تھا۔ وہ! میں کیسے بتاؤں وہ مجھے کتنا پیارا تھا؟ میں اپنی ہستی اس کی ہستی میں فنا کر دینا چاہتی تھی۔ میں اپنی روح اس کی روح میں تحلیل کر دینا چاہتی تھی۔ یوں کہ ہم ایک پیکر میں تبدیل ہو جائیں۔ ہم منجمد ہو کر رہ جائیں۔ ہمارے مجسمے کو سب سے اونچی پہاڑی پر گاڑ دیا جائے۔ آنے والی نسلیں ہمیں پوجیں۔ محبت کے فرشتے ہر صبح ہم پر بہشت کی معطر اوس برسائیں۔ مگر سپاہی جسے اس روز گاؤں کے دو آدمی ظالم سپاہی کہتے تھے۔ اندھیرے گنجان جنگلوں میں مجرموں کی تلاش میں پھرنے والا سپاہی پتھروں اور کانٹوں

سے کھیلنے والا فولادی انسان اور مجھے اتنا پیار! میرا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مجھے ان دنوں اکثر یہ خیال آتا تھا کہ میری موت دل کی حرکت بند ہو جانے سے واقع ہو گی کیونکہ اس کھینچا تانی سے میرا دل اکثر رک رک جایا کرتا تھا!

ایک روز کا ذکر ہے، میں صبح اٹھی موسم نہایت خوشگوار تھا۔ چڑیاں فضا میں قلابازیاں کھاتی جا رہی تھیں، چیلیں اور کوے گھونسلوں سے نکل کر ہوا میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پروں کو تول کر سو سو دو دو سو گز کے فاصلے پر تیر کی طرح اپنے ساتھی پر جھپٹتے تھے اور دور ارغوانی دھندلکوں میں غائب ہو کر پھر ظاہر ہو جاتے تھے ذیلدار کے گھر سے دھواں بل کھاتا ہوا ہزاروں ننھے ننھے مرغولے بناتا ہوا گاؤں پر برسے ہوئے بادل کی طرح تیر رہا تھا۔ میں خوش تھی، اجمیری سہیلی کی شادی تھی۔ مجھے اپنا بہترین لباس پہننا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، ریشمی کپڑے زیب تن کیے، سونے کے کنگن، سونے کے بندے، سونے کا کنٹھا، سونے کی مہر، چاندی کی ہنسلی پہنے، میں نے آئینہ دیکھا تو خوشی سے کانپ اٹھی۔ جی چاہا آئینے کو چوم لوں، جیب میں ڈال لوں اور گلی کوچے گھومتی پھروں!

"اور اس سب کچھ کے جلو میں مجھے ایک سپاہی کا متناسب جسم، اس کا مسکراتا ہوا، شرماتا ہوا، چہرہ نظر آ رہا تھا، وہ ڈھیلا ڈھالا لباس۔ وہ چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں، وہ سانولا رنگ، وہ لطیف سے خم والے مردانہ ہونٹ، وہ ٹھوڑی کا خفیف سا گڑھا، وہ ماتھے کا چمکتا ہوا ابھار، وہ آج مجھے ملے تو اسے آنکھوں کے رستے پی جاؤں لیکن لیکن!

"میں بھاگی بھاگی اپنی سہیلی کے گھر گئی۔ مہمان جمع تھے، شادیانے بج رہے تھے۔ سجے ہوئے لڑکوں اور لڑکیوں کی گہما گہمی اور بچوں کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ اس مجمع میں اچانک میری گردن کو کسی ٹھنڈے ہاتھ نے چھوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی بوڑھی کٹنی کھڑی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہے؟"

اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔ "بیٹی ذرا ادھر تو آؤ۔"

میں نے چڑ کر کہا۔ آخر بات کیا ہے۔"

اس نے میری طرف کچھ ایسے ملتجیانہ انداز سے دیکھا کہ مجھے اپنا سینہ چھلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں اس کے ساتھ ہو لی۔ وہ ایک دیوار کے پاس جا کر رک گئی۔

"تو آج مجھ پر رحم کرے گی بیٹی؟"

میں نے غصے سے کہا۔ ''کیا کہتی ہو کوئی بات بھی تو کرو؟''

''لیکن وعدہ کرو۔''

''ہاں' کہو''

''سپاہی میاں مر رہے ہیں!''

''مر رہے ہیں؟''

''ہاں مر رہے ہیں اور تمہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''مر رہے ہیں!'' میں ابھی اپنے حواس کو مجتمع نہ کر سکی تھی۔

''جی ہاں''

''میں ابھی آتی ہوں۔''

''لیکن وقت بہت کم ہے۔''

''کیا؟''

''وقت بہت کم ہے' وہ جلدی ختم ہو جائیں گے۔''

''ختم ہو جائیں گے؟''

''ہاں' ان کی حالت سخت خراب ہے۔''

''واقعی؟'' یکا یک مجھے محسوس ہوا کہ میں پھسلی جا رہی ہوں۔ مجھے اپنی حیثیت کا خیال رکھنا چاہیے۔ آخر میں نے اپنے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر اس بڑھیا سے صاف کہہ دیا کہ ''میں نہیں آ سکتی''

لیکن جب میں سہیلیوں میں آ کر بیٹھی تو میں نے خیال کیا کہ جیسے کوئی میری پسلیوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر میرے دل کو چھونا چاہتا ہے۔ کوئی میرے دماغ میں لوہے کی گرم گرم سلاخیں پھیر رہا ہے۔ میں دیوانوں کی طرح اٹھی۔ بھاگی بھاگی گھر آئی' سب لوگ شادی پر گئے ہوئے تھے۔ ''میرا سپاہی' میرا راجہ'' کہتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر گھر سے نکلی اور سپاہی کے گھر کی طرف بھاگنے لگی۔

یکا یک میری ایک سہیلی نے مجھے آواز دی۔ کدھر اڑی جا رہی ہو جانوں؟ ٹھہرو ذرا' تو نے کچھ سنا بھی؟''

''سپاہی مر گیا!''

''سپاہی مر گیا!''

''مر گیا؟'' میری چیخ نکل گئی۔ بھاگی' چکر کھا کر گری اور جب اٹھی تو میں نے دیکھا لوگ سپاہی کی لاش کو اس کے گاؤں کی طرف لے جا رہے تھے۔

یہ دیا کون جلائے؟

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور میلے کچیلے دیے کی دھواں اگلتی ہوئی زبان اس طرح لرزی جیسے درخت کا آخری زرد پتہ خزاں کے تند تھپیڑے سے ٹوٹ کر فضا میں کروٹیں بدلتا ہے۔ بیمار نوجوان کی بے رونق آنکھوں پر پانی کی مبہم سی تہہ چھا گئی۔ اس کی نگاہیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھت سے پرے کسی ایسی چیز کو دیکھ رہا ہے جسے آج تک کوئی نہیں دیکھ سکا۔ ہوا کے دوسرے جھونکے نے دیے کی لو جڑ سے اکھیڑ کر اندھیرے میں غرق کر دی اور کمرے میں کڑوے تیل کی تیز دم گھونٹنے والی بو کے سوا کچھ نہ رہا۔ بیمار نوجوان نے ایک لمبی آہ بھری اور کروٹ بدلتے ہوئے نہ جانے کس سے پوچھنے لگا۔ ''اب دیا کون جلائے؟ مجھے اندھیرے سے وحشت ہوتی ہے۔ خانو بھی اسٹیشن پر جا کر وہیں کا ہو رہا۔ اس کی ماں گاڑی سے اترتی تو سیدھی ادھر آتی۔ راہ میں اس کا کون بیٹھا تھا کہ وہاں اٹک جاتی!''

اس کے دماغ میں خیالات کا ایک سیلاب امڈ پڑا۔ کلیجے میں اٹھتی ہوئی پے بہ پے ٹیسوں سے بے پروا ہو کر وہ ماضی اور حال کی دھندلی وادیوں پر تصور کے پروں سے منڈلانے لگا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کے غیر محدود خلا میں ماضی کے مدہم مگر دلاویز نقوش نمایاں کرنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا۔

''اے بچپن کے دنو! بے وفا لمحو! واپس آؤ۔ میں تمہیں ابھی تک نہیں بھولا۔ ابھی تک نہیں بھولا۔ میں تمہاری گود میں پلا' تمہاری گود میں بڑھا لیکن تم روز بروز پیچھے ہٹتے گئے اور آخر اتنے دور ہو گئے کہ سوائے یاد کے اور کوئی طاقت تم تک نہیں پہنچ سکتی۔ تمہارے پاس میری چند امانتیں ہیں۔ میری معصوم خوشیاں اور میری بے پروا اور بے فکر مسکراہٹیں وہ واپس دے جاؤ پھر بے شک یاد سے محو ہو جانا۔

''میں وہ لمحے نہیں بھولا جب میں چاند کو ایک گیند سمجھ کر اس پر جھپٹتا تھا اور ہوا میں بے کار ہاتھ پیر مار کر تھک جاتا تھا تو اپنی ماں کی گود میں سو جاتا تھا۔ میں ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھتا تھا جو بجائے خود ایک خواب کی طرح حسین تھی۔ میرا روحانی وطن۔ اور اس کے نقوش اب سطح تصور پر نہیں ابھر سکتے۔ میں کس قدر دور ہو گیا ہوں اس سے۔ پھر جب آنکھ کھلتی تھی تو میں دیکھتا تھا کہ میرے ابا کام کر کے باہر سے آئے ہیں اور ماں کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں' ماں بھی مسکرا رہی ہے' میں بھی مسکرا دیتا تھا۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب میں نے

رونا شروع کیا تو بس روتا ہی رہا۔ ابا میرے سامنے ریچھ بن کر ناچے' مینڈک بن کر کودے' طوطی بن کر بولے' شیر بن کر غرائے' عجیب عجیب شکلیں بنائیں' الماری سے ایک جھنجھنا نکال لائے' چادر سے چند پیسے کھول کر فرش پر لڑھکائے مگر میں روتا رہا' اندر سے خوش بھی تھا پر روتا رہا۔ ان دنوں مجھے رونے اور ہنسنے میں کسی فرق کا احساس نہ تھا۔ خوش ہوتا تو رو دیتا خفا ہوتا تو ہنس دیتا۔ کسی نے تھپڑ لگایا تو خوشی سے بے ڈھنگی سی تالی بجا دی' کسی نے ہونٹ چومے تو منہ بسور کر یوں چیخا کہ ماں کی گود کے سوا اور کہیں قرار نہ ملا۔

''زینے کا اگلا درجہ چڑھتے ہی ماں کی آغوش پھیل کر ایک وسیع چار دیواری میں بدل گئی جہاں چوری چھپے سوندھی سوندھی خاک چاٹنا میرا معمول ہو گیا۔ پھر ایک دن ماں کا ہاتھ کنگن سمیت جو کان پر پڑا تو خاک پر قدم رکھنے میں بھی جھجک محسوس ہونے لگی۔ جس نے ہاتھ پھیلائے' بڑھ کر اس کے گلے سے چمٹ گئے۔ ریوڑیاں اور لڈو من بھاتا کھاجا' کڑوی چیزوں سے نفرت' اگر منہ میں بزور کوئی دوا ڈال دی گئی تو پھر حلق کو اس طرح بند کیا کہ مجبوراً سب کچھ باچھوں کے رستے باہر بہہ نکلا۔

''آہستہ آہستہ آنکھوں سے مہین مہین پردے سرکنے لگے۔ گھر پھیل کر قصبہ بن گیا۔ گاؤں کے چوکیدار کے گھر بیری کے درخت تلے آنکھ مچولی اور ''بوڑھی ماں کے گھر لے جاؤ'' کے کھیل' لڑکے لڑکیاں' چیخیں اور قہقہے' ناچ اور ناچ کے ساتھ گانا۔

میرے دل دیا محرم ڈھولا

ایک دن بوڑھی ماں کے گھر کا پتہ بتاتے ہوئے میں نے جو کرموں کو دھکا دیا تو بے چاری کانٹوں پر گر پڑی۔ ہتھیلیاں چھلنی ہو گئیں۔ دوسرے دن جب سب بیری تلے اکٹھے ہوئے تو کرموں کہنے لگی۔ ''اونہوں' ہم تو نواز کے ساتھ نہیں کھیلیں گے' یہ تو کانٹوں پر گرا دیتا ہے۔'' میں نے سمجھا خفا ہو گئی۔ کنکھیوں سے جو ایک دفعہ دیکھا تو دانتوں میں تنکا ڈالے مسکرا رہی تھی۔ ہمت بڑھ گئی' بانہہ پکڑ کر کہا۔ ''لے پوچھ بوڑھی ماں کے گھر کا پتہ۔ آج بوڑھی ماں تمہیں سرسوں کے پھولوں میں ملے گی۔'' اور جب ہم سرسوں کے کھیت میں پہنچے اور میں نے اسے پھولوں پر گرایا تو ہم اتنے ہنسے' اتنے ہنسے کہ پیٹ کے پٹھے تن گئے اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

پھر ابا دوسرے گاؤں میں چلے آئے۔ یہاں مزدوری زیادہ ملنے لگی۔

ایک دو دن تو میرا جی نہ لگا مگر آخر کرموں جیسی بیسیوں لڑکیاں مل گئیں۔ کھیل کھیل کر نمبردار کے گھر کی ڈیوڑھی کا فرش خاک بنا کر اڑا دیا۔ آخر نمبردار کی لاٹھی حرکت میں آئی اور ہم گاؤں سے باہر بھاگ نکلے۔ ہم دوڑتے جا رہے تھے کہ میرا پاؤں پھسل گیا اور گھٹنوں سے خون بہہ نکلا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں میرا مذاق اڑاتے آگے نکل گئے۔ مجھے اس وقت کرموں یاد آ گئی۔ ایک دفعہ اس نے بوڑھی بھٹیارن سے رو رو کر نسوار کی چٹکی حاصل کی تھی اور میرے ماتھے کے زخم پر چھڑکی تھی۔

''لڑکیوں میں نہ کھیلا کرو۔'' ایک دن ماں نے کہا اور عرصے تک یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ آخر اس میں قباحت کونسی ہے؟

ایک دن چوپال پر گیا تو ہر طرف سے کھجور اور گڑ کے تقاضے ہونے لگے۔ کہنے لگے تمہاری منگنی ہوگئی ہے۔ میں بھاگا بھاگا گھر آیا' ماں سے پوچھا۔ ''ماں میری منگنی کہاں کر دی؟'' کہنے لگی۔ ''جس گاؤں سے ہم آئے تھے' وہیں کے ایک غریب گھرانے میں۔'' میں نے سوچا'' کہیں ہو جائے کوئی مل جائے سم پوری کرنی ہے سو مجھے کیا؟''

ان دنوں میں نے عجیب عجیب پہلو بدلے۔ کبھی دوپہر کو گاؤں کی ویران گلیوں میں آوارہ پھر رہا ہوں۔ کبھی پنگھٹ کے کنارے شہتوت کے درخت کا سہارا لے کر گاگروں کی قل قل قل کے تال پر ماہیا کی کلیاں الاپ رہا ہوں۔ شادیوں میں چھت پر بیٹھ کر نوعمر لڑکیوں کے گیت سن رہا ہوں۔

وے	جہازاں	والیا	سائیاں
وے	سمندر	تساڈے	ڈھولا

میری شادی کا دن بھی آ پہنچا۔ برات گاؤں میں داخل ہوئی تو مجھے چوکیدار کا گھر یاد آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ تو سیٹھ جوالا پرشاد نے قرق کرا لیا ہے اور وہاں سیٹھ جی کی آٹے کی مشین چل رہی ہے۔ ''اور چوکیدار کدھر گیا؟'' ''جیل میں'' اور کرموں؟ میں نے پوچھنا چاہا۔ میرے تصورات میں وہ ابھی تک وہی پانچ چھ سالہ لڑکی تھی جس کی ہتھیلیوں میں کانٹے چبھے ہوئے تھے اور جس کے سیاہ بالوں میں سرسوں کے پیلے پیلے پھول مسکرا رہے تھے۔ مگر اب تو وہ جوان ہوگی۔ آہستہ آہستہ کرموں میرے جذبات پر چھانے لگی اور جب میرا نکاح پڑھا جا رہا تھا تو مولوی جی کی نورانی ڈاڑھی سے میری نظریں از خود ہٹیں اور کوٹھے کی طرف اٹھ گئیں۔ شاید ان بنی ٹھنی لڑکیوں میں کرموں سمٹی بیٹھی ہو مگر نگاہ خود بخود وہاں پر سے پھلانگتی گئی اور آخر پھر مولوی جی کی لمبی ہلتی ہوئی ڈاڑھی کی طرف پلٹ آئی۔ مجھے آگ لگ گئی۔ میرا کلیجہ پھٹنے کی حد تک پہنچ گیا۔ میں نے چاہا کہ ایک لمبی چیخ مار کر اپنے دل کا سارا غبار نکال دوں۔ میں کس سے پوچھوں کرموں کدھر ہے؟ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ برات کے واپس جانے کی تیاریاں ہونے لگیں' پر میرے دل پر ایک بار سا پڑ گیا تھا۔ گھر پہنچے' شام ہوئی' دلہن کو دیکھا تو دماغ نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا! زمین قلابازیاں کھاتی ہوئی معلوم ہوئی! ہر ساکن چیز متحرک ہو گئی! میرے سامنے کرموں بیٹھی تھی!

''کرموں' تم؟''

''تم؟ نواز؟''

"مجھے خیال ہی نہ تھا۔"

"اور مجھے کب خیال تھا۔"

"کرموں!"

"نواز!"

اس کے بعد میں اسے لے کر اس شہر میں آ گیا کہ اپنا اور اپنی کرموں کا پیٹ پالوں۔ باپ بوڑھا ہو گیا تھا اور ماں شادی کے بعد ہی ہیضے کی وبا کا شکار ہو گئی تھی' سو مجھے بھی ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی! یہاں خانو پیدا ہوا۔ دن مزے سے کٹنے لگے۔ بھوکے بھی سوتے تو پروا نہیں ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر سیر ہو جاتے تھے۔ نہ گلے نہ شکوے' وہ مجھ سے خوش میں اس سے خوش۔ اس سے برتن ٹوٹا میں نے کہا۔ "میں اور لے آؤں گا۔" میں دیر سے آیا تو اس نے کہا۔ "دیر ہو ہی جایا کرتی ہے۔" خانو ہمارا ننھا منا سرمایہ! اس کی توتلی باتیں! "ابا میلی ماں لوتی پکاتی ہے۔" "ابا آج میلا پتنگ کٹ گیا مجھے بہت شلم آ ئی!"

اب دس دن ہوئے کرموں دو ہفتوں کے لیے میکے گئی ہے۔ اسی دن شام کو مجھے زکام اور بخار نے آن دبوچا۔ رات کو دائیں پہلو میں درد ہونے لگا۔ مزدور بھائیوں نے کہا کہ نمونیہ ہے۔ تین دن چار پائی پر بل کھاتے گزرے۔ تنگ آ کر کرمس و کو خط لکھوایا کہ جلدی آؤ۔ آج اسے آنا ہے۔ کرموں کے سوا میری دیکھ بھال کون کر سکتا ہے؟ کرموں سامنے آئے تو سارے دکھ کافور ہو جائیں۔ اب وہ خدا کرے آ جائے۔ مگر آئے گی کیسے؟ گاڑی کا وقت تو کب کا گزر چکا۔ اور وہ خانو کدھر گم ہو گیا اندھیرے میں رستہ نہ بھول گیا ہو بے چارہ۔ اللہ مجھے تو اس اندھیرے سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ دیا کون جلائے؟

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا۔ بیمار نواز کے پہلو سے ٹیسوں کا طوفان اٹھا اور وہ چار پائی پر سمٹ کر گٹھڑی بن گیا۔ وہ پکار اٹھا۔ "ہائے ہائے میرے اللہ خانو ارے خانو او خانو بیٹا"

"جی ابا" دور سے آواز آئی۔ "اماں بھی آ رہی ہیں۔"

کمرے کا دروازہ دھک سے کھلا۔ "ہائیں!" خانو پکارا۔ "دیا تو بجھ گیا' اب اسے کون جلائے؟"

"میں جلاتی ہوں' تم ابا کو پکارو۔ کرموں نے بے حد تیزی اور بے تابی سے کہا۔

"ابا!" پھر کی آواز آئی۔ دیا جل اٹھا! کرموں بانہیں پھیلائے بیمار خاوند کی طرف بھاگی۔ "میرے مالک!" اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ابا!'' خانو چیخ اٹھا

بیار نواز چھت سے پرے کسی ایسی چیز کو دیکھ رہا تھا جسے آج تک کوئی نہیں دیکھ سکا۔ کرموں لڑکھڑا کر پیچھے گر گئی۔ خانو حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بلکتی ہوئی اٹھی اور بچے کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو چوم کر بولی۔ ''میرے لال! اب یہ دیا کون جلائے؟''

دیے کی لو تھرا اٹھی!

◆◆◆

بے چارہ

بے چارہ بیگار میں پکڑا گیا تھا۔ ذیلدار کی حکم عدولی کیسے کرتا۔ گاؤں کو چھوڑ کر اور کہیں جا بسنا اس کے بس کی بات نہ تھی ورنہ روز روز کی بیگار سے اس کی زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ سب ڈویژنل افسر کا دورہ تمام علاقے میں تھا اور اسے مرغوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ وہ سر پر ایک بڑا سا ٹوکرا رکھے کوئی دیہاتی راگ گنگناتا جا رہا تھا۔ مرغے ٹوکرے میں چیخ رہے تھے۔ دو ایک کی گردنیں ٹوکرے کے منہ پر بندھی جالی میں پھنسی ہوئی تھیں اور وہ گول گول ننھی ننھی آنکھوں سے نیلے آسمان کو گھور رہے تھے۔ اس اپنے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر جانا تھا۔ دلکشا بلندیاں گھومتی ہوئی پگڈنڈیاں گول سفید پتھروں سے پٹے ہوئے ڈھلوان رستے' گہری گھائیاں' گھائیوں کے دہانوں پر سبز گنجان جھاڑیوں کے جھرمٹ چڑیوں کی قطاریں چیلوں کے غول بکھرے ہوئے کھیتوں میں بٹیروں کی روح نواز تانیں۔ ننھی لڑکیوں کے کاندھوں پر لہراتی ہوئی میلی زلفیں' دوشیزاؤں کے گلابی چہرے' گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہاتھ۔ دہقانوں کی چوڑی ابھری ہوئی پیشانیوں پر خاک کی تہیں۔ وہ ہر روز انہیں دیکھا کرتا تھا' لیکن آج! آج خدا جانے اس کے نظریہ میں اتنی تبدیلی کیوں واقع ہو گئی تھی۔ اسے ہر چیز میں ایک بے نام سے کشش کارفرما نظر آتی تھی۔ یہ گول گول' ننھے ننھے پتھر! وہ چاہتا تھا ان پر لیٹ کر کروٹیں بدلے' ان پر کودے' ناچے! اور گھاٹیاں! ان میں اتر کر وہ ماہیا کی دردناک دکھ بھری ''کلیاں'' گائے اور پھر وہ دوشیزائیں! آغاز جوانی کے مجسمے! ان کو تا زیست دیکھا کرے نیلا نکھرا نکھرا آسمان! اسے اچک کر چوم لے وہ بیگار میں پکڑا گیا تھا' مگر پھر بھی وہ خوش تھا۔ اور کس لیے؟ آج صبح اسے پڑوس کی وہی لڑکی ملی تھی جسے دیکھنے سے اس کا جی کبھی نہیں بھرتا تھا اور اس لڑکی نے اس سے کہا تھا۔ اپنی آنکھیں جھکا کر ''آج شام کو مجھے سیاہ چٹان کے پاس ملنا!''

''بچنا بھائی!'' کسی نے آواز دی اور وہ رک گیا۔ ایک دہقان اک مضبوط بیل پر بھوسے کا بورا لادے کھڑا تھا۔ وہ ٹوکرے کو سنبھالتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' بیل والے نے بیل کو ہانکتے ہوئے کہا۔

''مڑال بنگلہ میں حصہ ضلع آیا ہے' ذیلدار نے مرغے بھجوائے ہیں۔''

''کسی میراثی کو کہہ دیا ہوتا۔'' بیل والے نے بیل کو ہانکتے ہوئے کہا۔

''سب کسی نہ کسی کام پر باہر گئے ہوئے تھے۔ صبح صبح ذیلدار کی نظریں مجھ پر ہی پڑیں۔ کیا ہوا بھائی ٹانگیں سیدھی کر لوں گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے جی اکتا گیا تھا۔''

''اچھا سلام الیکم۔''

''والیکم سلام۔'' اس نے الفاظ کو کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ وہ اس شخص سے اور بھی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ رنگین باتیں۔ جوانی کی ان پھولوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی۔ ان کھیتوں میں دوڑنے والی دوشیزاؤں کی' مگر وہ دور جا چکا تھا۔ آج شام کا وقت اور وہ سیاہ چٹان ...... اوہ! شام کو وہ پتھریلی خشک گھاٹی ایک جنت بن جائے گی جنت!

ایک مرغا جالی کو پھاڑ کر باہر آن گرا۔ بے چارے کی ٹانگیں تو بندھی ہوئی تھیں' لڑھک کر ایک جھاڑی میں اٹک گیا۔ اس نے ٹوکرا زمین پر رکھ کر اپنی پگڑی پھٹی ہوئی جگہ پر دھر دی۔ مسکراتا ہوا مغرور مرغے کے پاس پہنچا۔ اس کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پروں کو ہاتھ میں لیا اور اس کی گردن پر دو ایک دفعہ انگلیاں ماریں۔ جیسے اسے اس کے کئے کی سزا دے رہا ہے' اسے ٹوکرے میں بند کر دیا۔ جالی کی مرمت کی اور چل پڑا۔

''بیچو گے بھائی! یہ مرغے بیچو گے؟'' ایک معتبر صورت بزرگ نے اس سے پوچھا۔

''نہیں جی!''

''لے جا کہاں رہے ہو؟!

''پرسوں تھانیدار صاحب گاؤں کے سب مرغے اڑا گئے۔ اب حصہ ضلع کا فرمان آیا ہے کہ مرغے بھجواؤ۔''

اور وہ بزرگ بڑبڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

وہ حیران تھا کہ حصہ ضلع کا پیٹ اتنے مرغے کھا کر پھٹ کیوں نہیں جاتا؟ مرغے کا گوشت تو گرم ہوتا ہے! اس کا دماغ نہیں چکراتا؟ کہیں اسے دورے میں یرقان کی شکایت نہ ہو جائے! بیمار نہ ہو جائے وہ! اتنے مرغے اسے کیا معلوم کہ حصہ ضلع کے چیلے چانٹے بکروں کو نگل جاتے ہیں' مرغے تو پھر مرغے ہیں!

سامنے اسے ایک کنواں نظر آیا۔ دس گیارہ سال کی ایک لڑکی اکیلی بیٹھی رو رہی تھی۔

''یہ رو کیوں رہی ہے؟ دنیا آج اتنی خوش ہے۔ سنسار اتنا مسرور۔ اور یہ رو رہی ہے!'' اس نے سوچا۔

وہ اس کے پاس پہنچا۔ بے چاری کا ڈول کنوئیں میں گر گیا تھا۔ اس نے ڈول کی رسی پاس کے درخت سے باندھی اور نیچے کنوئیں

میں اتر گیا۔ پہاڑی کنوئیں۔ گہرے اور تاریک غار مگر رسی بھی مضبوط تھی اور وہ خود پہلے کئی بار کنوؤں میں اتر چکا تھا۔ وہ ڈول نکال کر اوپر چڑھ آیا۔ لڑکی خوش ہوگئی اور آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر مسکرانے لگی۔ وہ بھی بہت خوش ہوا اور ٹوکرا اٹھا کر آگے چل دیا۔

دور چوٹی پر ایک چرواہا اپنی بکریوں کا دودھ دوہ رہا تھا۔ ایک بوڑھی عورت کھیتوں کی مینڈھوں پر بیٹھی جنگلی ساگ توڑ رہی تھی۔ مزال کی جھیل سورج کی کرنوں کی وجہ سے خود کرنوں سے زیادہ چمک رہی تھی وہ چلتا گیا! خوش اور مست!

اور آخر اسے سرکاری بنگلہ نظر آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے سوچا وہ ابھی ٹوکرا دے کر واپس آجائے گا اور شام کو اس سیاہ چٹان کے پاس! اگر دنیا اتنی اچھی ہے تو جنت کا تصور ہی محال ہے!

بنگلہ قریب تھا۔ بنگلے کے باہر کئی دہقان بیٹھے تھے۔ برآمدے میں سرخ کوٹوں اور سنہری پیٹیوں والے بوڑھے اردلی اس طرح چکر کاٹ رہے تھے جیسے متعفن لاشوں پر گدھ منڈلاتے ہیں۔ دو منشی ناک کے سرے پر عینک دھرے کچھ لکھ رہے تھے۔ ایک اردلی نے اسے دیکھ لیا اور پگڑی کو ٹھیک کرتا ہوا چلمن اٹھا کر بنگلے کے اندر چلا گیا۔ وہ برآمدے کے قریب پہنچا۔ سفید سرخ رنگ کے موٹے سے ایک صاحب سگار کے کش لگاتے باہر نکلے۔

"کس نے بھیجے ہیں؟"

اس نے ٹوکرا زمین پر رکھ دیا اور سلام کیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ حصہ ضلع ایک غریب دہقان سے باتیں کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی! ایسے لوگ تو ذیلدار، نمبرداروں، تحصیلداروں اور تھانیداروں سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اور خوش ہوگیا۔

"چودھری جان محمد نے جی۔"

"اچھا، یہ یہاں رکھ دو اور سکیسر کی چوٹی پر یہ رقعہ بڑے صاحب کو جا کر دے دو۔ وہ تمہیں جو جواب دیں گے وہ واپس یہاں دے جانا، سمجھے؟"

اس کا سر چکرا گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کا خون نہ جانے کیوں رک گیا تھا۔ اس کی کنپٹیاں اور آنکھیں نہ جانے کیوں جلنے لگی تھیں! حصہ ضلع نے اسے ایک لفافہ پکڑا دیا۔ اس نے اسے پگڑی کے ایک سرے میں باندھا، سلام کیا اور بنگلے کا چکر کاٹ کر سڑک پر آپہنچا۔ دور سکیسر کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ کتنا دور ہے سکیسر! چار میل اس کے دامن تک اور پھر بارہ تیرہ میل اس کی چوٹی تک۔ شام نہ ہوجائے۔ اور وہ سیاہ چٹان!

اس نے تہ بند کو مضبوط سے باندھا' جوتے ہاتھ میں لیے۔ خدا کا نام لے کر بھاگنا شروع کر دیا۔ کیاریوں میں کام کرنے والی لڑکیاں اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ رستے کی کنکریوں کو اڑاتا ہوا لپکا جا رہا تھا۔ سکیسر کی چوٹی اسے اور دور کھسکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی مگر وہ بھاگتا اور آخر کار سکیسر کے دامن میں پہنچ گیا مگر اب وہ تھک چکا تھا۔ چار میل ایسے پتھریلے علاقے میں اپنی پوری طاقت سے دوڑنا دشوار سی بات ہے اور پھر وہ اونچی عمودی سڑک۔ تیرہ میل! اف' شام ہو جائے گی اور پھر اس چٹان کے پاس کوئی آ کر واپس چلا جائے گا! بے رحم حصہ ضلع! ظالم!

کائنات کی ہر چیز اسے مغموم نظر آنے لگی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور دانت پیس کر اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ کہیں دوڑتا' کہیں چلتا اور آخر وہ بالکل تھک گیا۔ پیاس سے اس کا گلا جلنے لگا۔ وہ لفافہ اسے اس ٹوکرے سے بھی بھاری معلوم ہو رہا تھا اور پھر دس میل اور...... سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ شام ابھی ابھی ہو جائے گی اور وہ سیاہ چٹان! کاش! ایک لمحے کے لیے اچھا خدا اسے پر دے دیتا۔ مگر اس نے اپنے بھاری پاؤں اوپر اٹھانے شروع کیے۔ رستے کے ہر پتھر میں اسے اپنے گاؤں کا نقشہ نظر آتا تھا۔ اور پھر وہ تنگ گلی! وہ لڑکی جسے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا اور وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا رستہ اور وہ سیاہ چٹان! شام کی دھندلاہٹیں!''

وہ بھاگنے لگا۔ وہ ایک جگہ اصل رستہ چھوڑ کر جھاڑیوں اور چٹانوں سے لٹک کر تیزی سے نیچے اترا' مگر اب اس کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ ایک پتھر پر بیٹھ کر سر دبایا۔ یہ افسر لوگ بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا! ناسمجھ خود غرض انسان! متکبر ریاکار لوگ! اور اب سورج اسے نظر نہ آتا تھا لیکن نیچے کھیتوں پر اس کی زرد شعاعیں کھیل رہی تھیں۔ مشرق کی طرف دور اسے اپنا گاؤں نظر آیا۔ اور وہ سیاہ چٹان مگر یہ گاؤں دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ اوپر چڑھتا گیا۔

اور آخر اسے ایک بنگلہ نظر آیا۔ بنگلے کے باہر ایک صاحب تین خوش پوش نوجوانوں کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ وہ بھاگا بھاگا ان کے پاس پہنچا۔ ادھر سورج نے مغربی افق کو چوما' ادھر اس نے رقعہ صاحب کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اب بھی وہ کوشش کرے تو آدھی رات کو اس سیاہ چٹان کے پاس پہنچ جائے گا اور وہ لڑکی اس کا انتظار کرے گی۔ ضرور کرے گی

''یہ رقعہ بڑے صاحب کا ہے ہمارا نہیں اس بنگلہ میں جاؤ۔''

صاحب سے رقعہ لے کر پھر پگڑی میں رکھا اور بھاگا۔ چاروں مہذب نوجوان قہقہے لگانے لگے مگر وہ بھاگتا ہی گیا۔

اور آخر وہ بڑے صاحب کے بنگلے کے قریب جا پہنچا۔ بڑے صاحب ایک کتے کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ اس نے سلام کر

کے رقعہ انہیں دے دیا۔ سلام کا جواب دیئے بغیر صاحب نے رقعہ کھولا اور منشی کو آواز دی۔

''اس شخص کو ایک رقعہ لکھ دو' موسیٰ خیل سے کچھ مرغے لے آئے گا۔ یہاں سے موسیٰ خیل کتنی دور ہے؟''

''بیس میل حضور!'' منشی نے ایک کمرے سے بھاگ کر نکلتے ہوئے اوور کوٹ کے بٹن بے ترتیبی سے اوپر نیچے چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''خیر صبح تک واپس آ جائے گا۔''

بے چارے نے بڑے صاحب کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اسے کھا جائے گا۔ منشی کی طرف دیکھا جیسے اسے نگل جائے گا' چبا جائے گا۔

منشی کے ہاتھ سے رقعہ لے کر پگڑی کے ایک سرے میں باندھا۔ شفق سے دھوئی ہوئی وادی کے اس پار اسے اپنے گاؤں کے دھندلے دھندلے نقوش نظر آ رہے تھے اور پھر وہ پڑوس کی لڑکی جسے دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا۔ وہ سیاہ چٹان جس کے پاس اس وقت وہ لڑکی بیٹھی ہوگی۔ اس کا منہ کھلا ہوگا۔ اس کی آنکھیں منتظر ہوں گی۔ اس کے بال منتشر ہوں گے اور اس کے گلابی رخساروں کی چمک ماند پڑ رہی ہوگی۔ میرے خدا!

اس نے پلکوں پر لرزتے ہوئے دو موٹے موٹے آنسوؤں کو پونچھا اور سر جھکائے موسیٰ خیل کی طرف چل پڑا۔ بے چارہ!

◆◆◆